احمد فرازؔ
شخصیت اور شاعری

احمد فرازؔ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

احمد فراز شخصیت اور شاعری

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

احمد فرازؔ

شخصیت اور شاعری

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

سابق صدر شعبۂ اردو، فارسی اور عربی، انجمن آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور
کرناٹک اسٹیٹ، انڈیا

سابق۔ پی ایچ ڈی گائیڈ، شعبۂ اردو رفارسی
کرناٹک یونیورسٹی، دھارواڑ۔ کرناٹک اسٹیٹ۔ انڈیا

(لائف ٹائیم اچیومنٹ ایوارڈ۔ اردو۔ ۲۰۱۱ء)

(پونہ۔ ہندوستان)

نام کتاب : احمد فراز شخصیت اور شاعری

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

بی۔اے۔بی۔کام،ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی

سن اشاعت : ۲۰۱۵ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ......

پبلیشر : بلو اسٹار پرنٹرس، بیجاپور

کتاب ملنے کے پتے

Moulana Sayed Faisal Sakaf Sadat
MOL
Sakafia Educationl Trust, Sakaf Roza, Bijapur-586101
(Karnatak State) INDIA, Cell 09880100481
hussainisadat@gmail.com

BASHEER AHMED KHADIM
Near Roshan Darwaza, Bada Asar Mahal Galli,
BIJAPUR - 586101
(Krnataka State) INDIA
Tel : 9480035786
E.mail. basheerahmedkhadim@gmai.com

BOOKWARE# 85, 1st Floor, Near Police State JC Nagar, Bangalore-560006 (Karnatak State) INDIA, Cell # 9844158731. E-mail: bookware.com@gmail.com

S.S.Sayed Fattah, Beside Kali Masjid, JM Road, Bijapur-586101 (Karnatak State) INDIA.

Sultan Akhtar, Flat No.5. heaven Pride, Shaniware Peth, Solapur-413002(State Maharashtra) INDIA. Tel # 735-059-3794,
E-mail: Sultanakhater1980@rediffmail.com

Dr. Abdulkhadar Faroqui 86-35, Queens Blvd # 4F, elmhurst-NY 11373, USA,
Tel: 7182050924, Fax# 7186511509, Email: agfaroqui@yahoo.com

فہرستِ مضامین

انتساب

مرحوم پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار (بیجاپور۔انڈیا)

شعبہ اردو و فارسی۔BELDE آرٹس کالج بیجاپور اور

گورنمنٹ کالج بیدر کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ تشکر

خالقِ کائنات کی مہربانی ہے کہ اردو ادب کی دنیا میں سفر کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ میں ایک طالبِ علم ہونے کے باوجود مجھے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

۲۰۱۵ء میں حکومت کرناٹک بنگلور میں کرناٹک اردو اکاڈمی نے میری کتاب ”کینڈا اور ریاست ہائی متحدہ امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات“ پر ایوارڈز سے میری عزت افزائی کی جس کے لئے میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری چیرمن کرناٹک اردو اکاڈمی اور کرناٹک اردو اکاڈمی کے تمام ممبران کا احسان منداور شکر گذار ہوں۔

۲۰۱۱ء میں ”اردو کانسل“ پیمپری پونہ (مہاراشٹرا اسٹیٹ) جو حکومت ہند کا ادراہ جس کی جانب سے ”لائف ٹائم اچیومنٹ اردو“ کے ایوارڈز سے میری عزت افزائی کی جس کے لئے ”اردو کونسل“ کے چیرمن عالجناب قاسم زبیری اور تمام ممبران کا احسان مندار شکر گذار ہوں۔

نیویارک میں مرحوم احمد فرازؔ سے مختصر ملاقات ہوئی اور میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مرحوم احمد فرازؔ کی شعری خدمات پر مقالہ لکھوں۔ اور مرحوم احمد فرازؔ مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ مقالہ کیوں کتاب ہی لکھ ڈالو۔ اور میرا یہ مقالہ ”اردو ٹائمز“ نے شائع کیا جس کے لئے میں الحاج خلیل الرحمٰن صاحب ایڈیٹر ”اردو ٹائمز“ کا شکر گذار ہوں

محترم گل بخشالوی پاکستان کے معرف شاعر اور ادیب جن سے ملاقات نیویارک میں ہوئی پاکستان میں ہی رہائش پذیر ہیں انہوں نے فون پر فرمائش کی کہ وہ ان کے رسالہ ”قلم قافلہ“ جو مرحوم احمد فرازؔ نمبر شائع کرنے والے ہیں مقالہ روانہ کریں۔ ان کی فرمائش پر مرحوم احمد فرازؔ پر چار مقالے

جوتمام کے تمام ''قلم قافلہ'' کی زینت بنے۔ میں محترم گل بخشالوی کا شکرگذار ہوں کہ ''پاکستان'' سے شائع ہونے والا رسالہ ''قلم قافلہ'' میں شامل ہونے کا موقع عطا کیا۔

نیویارک میں مرحوم احمد فرآز کے دوست اور احباب ''پروفیسر یونس شرر'' ڈاکٹر محمد شفیق، ڈاکٹر صبیحہ صبا، پروفیسر خالدہ ظہور، فیروز احمد صفی، شکاگو امریکہ سے محترمہ غوثیہ سلطانہ، ہندوستان سے پروفیسر میر تراب علی، پروفیسر ڈاکٹر علیم اللہ حسینی، سلطان اختر اپنے ادبی تعاون سے اس تصنیف کو حُسن عطا کیا۔ تسنیم شہزاد جو نیویارک میں معرف فوٹوگرافر ہیں انہوں نے مرحوم احمد فرآز کے چند تصاویر دی جس کے لئے میں ان کا بہت ہی شکرگذار ہوں۔

ہندوستان کے سفر کے دوران مختلف شہروں میں اعزازی جلسہ منعقد کئے گئے، بنگلور، دھولیہ، سولاپور، اور دوسرے شہروں میں ادب نواز کا بے حد شکرگذار ہوں۔

کرناٹک ویمنس یونیورسٹی بیجاپور، شعبہ اردو نے میرے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا جس کے لئے میں بہت ہی شکرگذار ہوں۔

پروفیسر پرنسپل عبدالقادر نولگند، پروفیسر پرنسپل سید حمید قادری ہریال، پروفیسر ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سمیع الدین، عالمی شہرت یافتہ سلیمان خمآر، سلطان اختر جن کی ہمت افزائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی جس کے لئے میں شکرگذار ہوں۔

رفیع بھنڈاری معروف صحافی، حکومت ہند ''اردو کانسل'' اور حکومت کرناٹک، کرناٹک اردو اکاڈمی کے رکن ہیں جنہوں نے مجھے عزت بخشی جس کا میں احسان مند ہوں۔

ایک اور اعلیٰ شخصیت کونسلر سید ادریس بخشی جنہوں نے ہر وقت اور ہر لمحہ میرے لئے تکلیف اُٹھا کر میرے ہندوستان کے سفر کو رونق عطا کی اپنے تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھکر میرے ساتھ

رہے میں نہ صرف احسان مند بلکہ ان کا بہت ہی مشکور ہوں۔

میرے تصانیف شائع نہ ہوتے تو پھر ادب میں میری شناخت نہ ہوتی اور اس شناخت کی ذمہ داری میرے عزیز دوست سید مصطفےٰ قادری سادات جن کی ہر لمحہ کوشش اور محنت ہی ہے جو تصانیف کو ادب میں شامل ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ جن کا میں ہمیشہ ہمیشہ شکر گذار اور احسان مند ہوں۔

مولانا بشیر احمد خادم ہو میرے عزیز دوست اور بلیو اسٹار پبلیشر کے مالک ہیں اور جناب سید تنویر احمد بک ویر بنگلور کا شکر گذار ہوں ان کے علاوہ تمام احباب اور ادب نواز حضرات کا مشکور ہوں جن کے ناموں کی فہرست طویل ہو جائے گی اس طوالت کے خوف سے ان تمام سے معافی چاہتا ہوں جن کے نام شامل نہیں کیئے گئے۔

''احمد فراز شخصیت اور شاعری'' ایک طالب علم کی حیثیت سے کوشش کی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ان کے کلام کو شامل کیا گیا ہے تا کہ نہ صرف قاری، ادب نواز بلکہ تحقیق سے تعلق لکھنے والے طالب علموں کے لئے مفید ہو۔ امید ہے E-mail کے ذریعہ اپنے مشوروں سے میری ہمت افزائی کریں۔

شکریہ

خاکسار

عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

حرفِ چند

پروفیسر یونس شرر

اردو شاعری موضوعات اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اپنی شناخت تسلیم کرا چکی ہے۔ بہت سی جہتوں میں یہ اپنی ہم عصر زبانوں میں بہت آگے نکل چکی ہے موجودہ صدی کے جن شعراء نے اسے یہ نذر و منزلت بخشی ہے۔ ان میں فیضؔ، مصطفٰے زہری، فرازؔ راشدؔ اور میرا جیؔ کے علاوہ بہت سے نام ہیں، یہ نام تمثیلات اور پیکر سازی کے پیراہن کی ادبی و شعری تاریخ ہیں۔

ان شعراء میں جو فارسی کی شعری روایات سے جڑے رہے اور کچھ مغرب پرستی کے رجحانات و پیلانات کے بہاؤ میں تحریریت کا شکار ہو کر جدیدیت کے بے معنی سفر کو منزل سمجھ بیٹھے۔ لیکن ترقی پسند شعراء نے ادب و شعر کو زندگی کی معنویت سے ہمکنار کیا زندگی کی اس معنویت کو پانے میں تاریخ اور حالات کا حلالہ کیا اور دعوتِ فکر و عمل دی یہ وصف صوفیانہ شاعری کو حاصل تھا۔ جو بے صدا گلی کوچوں میں شاہ اور شاہ پرستوں خانقاہیں اور خانقاہ نشین کھلا چیلنج تھے۔ جہاں بے نوا، اپنی داد و فریاد رسی کے جمع رہتے، خانقاہیں شہنشاہیت کے لئے خطرہ تصور کی جاتی تھیں۔ اس لئے کہ صوفیانہ شاعری کا اظہار انسانی دردمندی، ان سے محبت، عجز و انکسار، طاقت پر فخر و غرور کے بجائے، خوش وراء مالک و مختاری سے گریز کی تلقین تھی۔

شاعری کے اس گر کو ترقی پسند شعراء نے اپنی گرہ سے باندھ لیا تھا۔ صوفیانہ شاعری چراغ مند پڑتے ہی ان کی آواز کا سوز و گداز فضا میں وقت کی ضرورت بن کر پھیل گیا۔ اور ان شعراء نے حاکم و محکوم، غلامی و آزادی کے درمیان لکیر کھینچ دی، انصاف و آزادی کے لئے تہ آباد یاتی نظام کی چیرہ دستوں سے نجات، سامراجی قوتوں، آریت جابر حاکموں کے ظلم و جبر سے چھٹکارا دلانے کے لئے

احمد فراز نے سرِ کوٹے رقیباں پہنچ کر کسی قرینے سے سنگ فرشوں سے اس امر کا اظہار کیا ہے۔

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبادو

ہم لوگ نو اگر ہیں، ہمیں اذنِ نوا دو

احمد فراز پر گفتگو کرنے کے لئے میں نے یہ تمہید اس لئے باندھی کہ میں یہ واضح کردوں کہ تصوف اور صوفیانہ شاعری جو خانقاہوں میں درویشی لئے ہوتے شہنشاہوں کے لئے لکھی تھی اور جبروت شاہی کے پردے چاک کرتی تھی عہدِ حاضر میں یہ منصب ترقی پسند شعراء کو حاصل ہوا احمد فراز کی شاعری اور زندگی انسانی کردار کی سربلندی کے لئے آئینہ خانہ ہے، ان کی شاعری زندگی کی بے رحمی کی ہر صورت حال کا احوال جرائت مندی کے ساتھ ہے، زندگی مسلسل اذیت کے ساتھ چلتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُس کے سامنے سپر ڈال دیں۔ مگر فراز اس عالم میں سپر اٹھانے کی طاقت مزاہم کرتا ہے، وہ زندگی جو ایک فاحشہ کی طرح دیکھنے والوں کے بینائی پر گرانباری چھوڑتی ہے، اس کی آواز تنہائی اور تاریکی میں اُجالا بن جاتی ہے۔

احمد فراز غزل کا شاعر ہے، غزل میں دھیما دھیما لہجہ نرم و نازک جذبات پھیلا ہوا ہے، جوانی کے تپتے موسموں کی کہانی لئے ہوئے ہے، محبوب اور محبوبیت کا حال حسن کی بے اعتنائیوں اور عشق کی سوختہ سامانیوں کے ساتھ بخل مقدس کی صورت ہیں دل کی پنہائیوں میں عمر کے آخری حصہ تک سر سبز و شاداب زندگی کی بہاریں لئے ہوئے ہے مصطفےٰ زہری نے شہر آذر میں اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ "نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے اس افتادِ طبع سے جو شعر نمودار ہوتے ہیں ان کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ آگے چل کر شاعر اس رنگ کو ترستا ہے، اپنی آواز اور رنگ کو بدلتا ہوا دیکھ کر زہری کی یہ بات بجا مگر فراز تو آخری عمر تک ان جذبات کی سنسناہٹ کو سنتے رہے۔ اسی لئے ان کے

کچھ حستادوں نے انہیں یونیورسٹی اور کالجوں کے لڑکے اور لڑکیوں کا شاعر کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی ۔مگر فراز کو کسی نشاد نی سند کی ضرورت نہیں پڑی ۔فراز کو یہ بات معلوم تھی کہ وہی نقاد تخلیق کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے جو خود تخلیق کار ہو اور تخلیق کے مراحل کو عہد علم و تاریخ اور شعور کی سطح پر سمجھ سکتا ہو۔اسے یہ معلوم ہو کہ فنکار جب سانس لیتا ہے تو درد کی تپش اُس کے وجود کو جھلسا دیتی ہے۔ تخلیق کار کا ضمیر اور خمیر ابتاء کی کس میزان پر جائز ہے کیونکہ ہم اکثر بیشتر اپنے جسم کی شعلگی کو دوسرے شخص کی تمناؤں کی خوشر چھنی سے سیراب کرتے ہیں۔ان کی غزلیں کبھی اور نظمیں کبھی ہمیشہ جراءتِ نو جوانوں کی کہانی سناتی رہیں ۔شکوہ، شکایات اور گلہ بھی رہا اور تاریخ و حالات دوٹوک بات کہنے کی حوصلہ مندی بھی رہی، اُس کے قلم کو کوئی زنجیر نہ پہنا سکا۔فراز کی آواز کلاسیکی روایت کو نہ صرف آگے بڑھاتی ہے بلکہ اُس پر اپنی مہر لگاتی ہے۔ان کے شعروں میں توانائی، ماجی سے تسلسل اور ربط ان کے نظریۂ فن میں انسانی انداز کی سر بلندی لئے ہوئے ہے۔فراز جس دردمندی کے ساتھ جذبات، احساسات اور منظروں کو پیش کرتے ہیں وہ دل کو چیرتی ہوئی گذرتی ہے۔

تو کسی قریہ زنداں میں شاید کہ جہاں
طوق ہی طوق ہیں، دیواریں ہی دیواریں ہیں

یہی دردمندی ہم ان کے منظوم ڈراموں میں بھی دیکھتے ہیں۔فراز مکمل فکر و نظر کی آزادی پر جان دیتا تھا۔وہ انسان چاہے بیروت میں ہو یا ویت نام پانی سرزمین پر ٹکٹی پر بندھا جابر حکمران کے حقوق و آزادی کے لئے کوڑے کھائے لہولہان ہو۔

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کردیا
اے شہر یار تو بھی تو اپنا حساب دے

فرازؔ بے یارومددگار بے بس مسکینوں پر تقدس شجر کے شارنگ پتوں کو ہمیشہ سائبان بنا رہا۔ شعر کے تہذیبی عناصر سے شعر وادب کے جگمگا تا رہا۔ سفاک لمحوں کے ہاتھوں کھلے ہوئے حریت پر ستوں کے گرہ کے ساتھ آزادی اور انصاف کا پرچم لئے ہوئے اُن کے قدموں سے ملاملا کر چلتا رہا۔ وطن کی صورتِ حال اور علمی طاقتوں کی چھوٹی قوموں پر گرنت حاصل کرنے کی خواہش اُن کے نہ صرف پیشِ نظر رہی بلکہ فرازؔ کے وجدان روحوں کو قوت سے ہمکنار کرتی رہی۔ فرازؔ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ جب الفاظ دبائے جاتے ہیں تو بازو اُٹھ جاتے ہیں۔ اُن کی نظمیں، پیشہ ور قاتلو اور محاصرہ اس امر کی گواہ ہیں جہاں سُبک بندی کے تمام اوصاف جو بیدل سے لے کر غالب تک آئے ہیں فرازؔ نے انہیں اپنی ح سازی، زور بیان، رفت خیال، مضمون آفرینیشی اور تمثال کاری بڑی ہنر مندی کے ساتھ اپنے فن میں استعمال کیا ہے۔ جو روایت اور کلاسیکی مہران پر ان کی گرفت کا احساس دلاتی ہے۔

ڈاکٹر عبدلقادر فاروقی نے فرازؔ کے منتخب غزلوں اور نظموں کے علاوہ اُن کے ڈرامے بھی سامنے رکھے ہیں اور خاص نقطۂ نظر سے اُس کا جائزہ بھی لیا ہے، فاروقی صاحب نیویارک کی معروف علمی وادبی شخصیت ہیں ہمیشہ اردو کی ترویج واشاعت کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ آٹھ تو کتابوں کے مصنف ہیں، تصنیف وتالیف ان کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ فرازؔ پہلے وہ شمالی امریکہ اور کینڈا میں بسنے والے ادیب وشاعر اور شاعرا کے تعارف اور ان کی تخلیقات پر اپنے تاثرات اور جائزہ کی صورت میں۔ ایک حد تک امریکہ کی ادبی وشعری تاریخ مرتب کر دی ہے۔ جو مستقبل میں اردو کی علمی وادبی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لئے نہ صرف حوالہ بلکہ رہنمائی کا سبب بنے گی۔

فاروقی صاحب ہمیشہ کسی نہ کسی کتاب کی تیاری یا علمی وادبی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں

اب ان کی نئی کتاب احمد فرازؔ کی شخصیت اور شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اہم کام ہے اور فراز سے ان کی محبت اور لگاؤ کا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں فرازؔ کی شخصیت اور شاعری کے ادوار کو اس طرح سمیٹا ہے کہ فرازؔ پر ابتک چھپنے والی کتابوں میں یہ اضافہ تصور کی جائے گی اور علمی و ادبی حلقں میں قابلِ قدر اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ اس کتاب میں فرازؔ کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ احوال وطن سیاسی اور تاریخی صورتِ حال کے علاوہ گذشتہ صدی کا پورا منظر نامہ تصویر بن جاتا ہے اس جذبۂ احساس کو بیدار کرنے کے لئے عبدالقادر فاروقی قابلِ مبارکباد ہیں۔

اس کتاب کا ایک اور افادی پہلو قابلِ غور ہے۔ فرازؔ کے منظوم ڈرامے جن سے قارئین بہت کم واقف ہیں یا بے خبر ہیں۔ وہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں اور فرازؔ کے افکار و خیالات بڑی وضاحت اور صفائی سے ان ڈراموں میں پیش ہوئے ہیں۔ انسانی رڈے اور انسانیت کے مختلف پہلو کردار مکالوں کی ادائیگی میں فرازؔ کے نقطۂ نظر پر تفہیم اور تہ داری کے پردے نہیں پڑے ہوئے ان ڈراموں میں بھی فرازؔ اپنے بھرپور روحانی لہجہ کے ساتھ موجود ہیں جو نغمگی اور غنائیت سے لبریز ہیں۔

ان کے برعکس اختر الایمان کے منظوم ڈرامے غیر روحانی اور کھردرے ہیں۔ ان کے مکالوں اور کرداروں کی زبان فلسفہ کی کہر میں دبی ہوئی ہے۔ وہ خاک وخون ہو یا تاریک سیارہ ان میں زندگی عبرت آموزی کے ساتھ زمین سے تاحد، نظر ٹھہری ہوئی فضا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جسے ہم انجیل مقدس میں لکھے ہوئے حرفوں کی تلاوت کر رہے ہیں۔

فرازؔ کے ڈراموں کی فضا حدت گرمی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ ان ڈراموں میں فرازؔ نے نظم حصرا آزاد نظم اور نثری نظم کے فارم اور ہیئت کو موقع اور محل کے اعتبار سے بڑی فنکاری سے برتا ہے۔

ایسے اسلوب میں شعری حسن اور جمالیاتی کو برقرار رکھے ہوئے مکالوں اور کرداروں سے انصاف کیا ہے۔

فرآز کی شخصیت اور شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اپنے دلوں کے جذبے اور احساسات کے عکس کو دیکھ سکتے ہیں۔ عبدالقادر فاروقی کو ایک بار پھر مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے فرآز کے ساتھ ہمیں باندھ دیا ہے آخر میں فرآز کے اس شعر پر اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا۔

وہ رشک غزالاں تھا، مگر جام میں اُس کے
ہم جیسے کئی پید زبوں حال سنہرے تھے

یونس شرر نیویارک

پروفیسر یونس شرر

صدر شعبۂ اردو اور صحافت

وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

Address
Prof. Yunus Sharar
8300 Talbot Street # 7c
Kew Garden NY. 114115

احمد فراز

قوم کی وہ آن تھا احمد فراز
وہ وطن کی شان تھا احمد فراز

حسن کی سامان تھا احمد فراز
عشق کا وجدان تھا احمد فراز

ہے ادب کو ناز اس کی ذات پر
شعر کا ارمان تھا احمد فراز

اس کے شعروں پر تھیں رقصاں تتلیاں
جگنوؤں کی تان تھا احمد فراز

شعر کی پریاں تھیں اس کے ارد گرد
شاعری کی جان تھا احمد فراز

وہ ادب کے آسمانوں کا چراغ
روشنی کا مان تھا احمد فراز

وہ کہ پیری میں بن تھا رشکِ شباب
روپ کا عنوان تھا احمد فراز

تھا ہمالہ کو بھی اس پر رشک سا
وہ بلند انسان تھا احمد فراز

ظلم کی تیرہ شبی کے درمان
صبح کا عرفان تھا احمد فراز

غیرتِ افغان اس کے خوں میں تھی
عظمتوں کی کان تھا احمد فراز

صاف گوئی حق پرستی کی چٹان
عزم کا فاران تھا فراز

جابروں کی راہ کا پتھر تھا وہ
جور کا بطلان تھا احمد فراز

وہ مساواتِ محمدؐ کا نقیب
عدل کی میزان تھا احمد فراز

جس نے بوئے عظمتِ انساں کے بیج
ایسا اک دہقان تھا احمد فراز

آمروں کی آنکھ کا کانٹا تھا وہ
پھولوں کا عنوان تھا احمد فراز

حاکمانِ وقت اس کے کاسہ لیس
طبع کا سلطان تھا احمد فراز

شاعروں کے بالاتر ایوان کا
قائدِ ایوان تھا احمد فراز

وہ شہنشاہِ غزل اعجاز تھا
نظم کا پردھان تھا احمد فراز

قوم کی وہ آن تھا احمد فراز
حسن کی سامان تھا احمد فراز

ہے ادب کو ناز اس کی ذات پر

اس کے شعروں پر تھیں رقصاں تتلیاں
شعر کی پریاں تھیں اس کے اردگرد
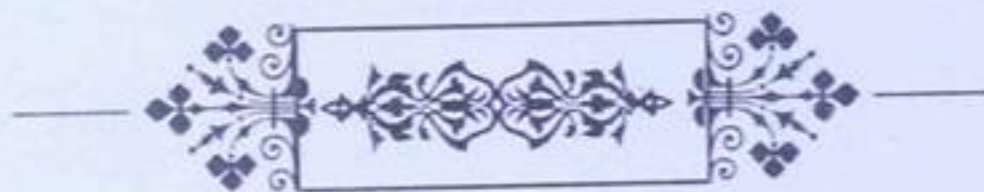
پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی ادبی حیثیت

فیروز احمد سیفی

زبانوں کی تاریخ کا بغور جائزہ لیا جائے یہ حقیقت سامے آتی ہے کہ اردو زبان ایک قلیل مدت میں باضابطہ ایک مسلّم زبان کا درجہ حاصل کیا۔ اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے جو اپنی چاشنی اور مٹھاس کی بنا برِ صغیر کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے یورپ اور امریکہ کو اپنا دوسرا گھر بنایا۔ وہ تمام ادبی شخصیات قابلِ ستائش ہیں جنھوں نے دیار فرنگ میں اپنی قومی و ملی اردو زبان وادب کو یہاں بسایا اور اس کی نشو ونما اور بقا کے لئے کوشاں ہیں۔

نیویارک کا ادبی حلقہ اب ایک دبستان کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں ادبی احباب اپنی منفرد طرز تحریروں سے معروف ہیں۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی صاحب کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے یہاں کی فدا اور ادبی شخصیات آپ کو کئی ناموں سے نوازا ہے۔ کسی نے "امریکہ میں اردو کا ادبی خزانہ" کہا ہے تو کسی نے "نیویارک کا بیش بہاں سرمایہ" کسی نے "امریکہ میں اردو کا بے لوث خادم" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور کسی نے "امت مسلمہ کے غمخوار اور اصلاحی مضمون نگار"

اے پیکرِ خوبی تجھے کس نام سے پکاروں

فاروقی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اس دورِ فتنہ آخر زماں میں ایسی شخصیات قال قال نظر آتی ہیں۔ جبکہ ہر طرف ویرانی کا راج ہے۔ دل ہیں کہ مردہ ہو چکے ہیں۔ اور انسان کواب غفلت کے نشئہ میں ڈوب چکا ہے۔ ایسے پُر آشوب ماحول میں ڈاکٹر صاحب اپنی تخلیقات قرآن حکیم اور احادیث کی روشنی میں زینت قرطاس بنا کر سوئے ہوئے انسانوں کو جگانے کی کوشش

میں لگے ہوئے ہیں۔زندگی کے تجربات اور ذاتی مشاہدات کا پرتو آپ کی تحریروں میں جان ڈال دیتا ہے۔زبان و بیاں میں سادگی بیساختگی اور طرز ,بیاں کی شگفتگی کیف آور ہے۔

فاروقی صاحب مملکت عادلشاہی کے قدیم شہر بیجاپور کے معروف خانوادے فاروقی کے چشمِ چراغ ہیں۔یہ اسی خانوادے کا فیض جو سادگی ،انکساری، بے نیازی امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبودی کی تڑپ جیسی عظیم نعمتوں سے نوازے گئے ہیں۔جسے صرف اہل دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

آپ ایک اعلی پائے کے ادیب، مفکر، افسانہ نگار، تنقید نگار، مکالہ نگار اور مضمون نگار ہیں۔

جب ہم آپ کے تبصروں کا گہرائی سے جائزہ لیں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے آپ بڑی سادگی سے تحریروں پر گرہ باندھتے ہوئے اس کا تجزیہ واضح انداز میں کرتے ہیں کہ قاری سوچتے ہی رہ جاتا ہے کہ ہمارا ذہن اس پہلو کی طرف مائل نہیں ہوا۔آپ عام لوگوں کے مسائل کو عام فہم زبان میں پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔قلم قاری اور قرطاس سے رشتہ کس طرح استوار رکھا جاتا ہے بخوبی واقف ہیں آپ کا یہ منفرد طرز تحریر آپ کی مقبولیت کا سر چشمہ ہے۔آپ ایک دردمند دل انسان ہیں۔ہمیشہ امت مسلمہ جو زبوں حالی کا شکار ہے اپنی تحریروں کے ذریعہ راہ راست پر لانے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔آپ بڑے زندہ دل خوش طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ایسے میں آپ کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

رکھیو یارب یہ در گنجینہ گو ہر کھلا

احمد فراز ایک ایسے شاعر جو شہر نابینا میں دیدۂ بینا لکھتے تھے ساری عمر امن و محبت کے فروغ کے لئے معاشرے پر جو ظلم اور ناانصافیاں ہوتی ہیں ان کے خلاف شاعری کے ذریعہ جہاد کرتے رہے۔

آپ کا پیغام صرف اور صرف امن و محبت تھا۔وہ امن جو اب دنیا سے ناپید ہو چکا ہے اور وہ محبت جو ختم

ہو چکی ہے احمد فرازؔ کی شخصیت ، آفاقیت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جو رنگ و نسل مذہب وقوم سے بالاتر ہو کر انسانیت کا نعرہ بلند کیا۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ہمیشہ مظلوم کے لئے بے چین اور بے قرار رہے۔

فاروقی صاحب کی تصنیف احمد فراز پر نہ صرف امریکہ بلکہ تمام عالمی اردو ادب کے لئے وہ تحفہ ہے جس سے ہر خاص و عام مستفید ہوگا۔ اور اس تصنیف سے احمد فرازؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ میری دعا ہے اس تصنیف کو علمی اردو ادب میں ایک مقام حاصل ہو۔

فیروز احمد سیفی

Fairoz Ahmed Saifi
90-02, 143rd Street
Jamaica. NY. 11435
U.S.A.

مضمون

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی اور میری رفاقت کم وبیش ڈیڑھ دھائی پر محیط ہے۔ بیجاپور کا ادبی حلقہ اور آردو کا طالب علم آپ کی اردودانی کا ہمیشہ معترف رہا ہے۔ فاروقی صاحب کے اکثر و بیشتر مضامین سالار کے ادبی اڈیشن میں گاہے بگاہے چھپتے رہتے تھے۔ انجمن ڈگری کالج کے بانی اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ صدر شعبۂ اُردو کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اخلاص کے دھنی، خوش گفتار، جاں نثارانِ اُردو کے علم بردار۔ اُردو کی خدمت کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر وقت تیار۔ اُردو کے طلباء کی تشنگی علمی ان کے ذاتی لائبریری سے پوری ہوتی رہی نہ موافق حالات کو اپنے حق میں کر لینے کا گُر ان کو خوب آتا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت میں سینہ تیر رہنا اور بے باکی سے اُس کا سامنا کرنا، دوستوں اور دشمنوں کو اکھٹا رکھنا اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول رہنا مخلصانہ مہربانی سے مہمانوں کو مسحور کرنا۔ ہمیشہ علمی انہماک سے سروکار رکھا۔

اب جبکہ امریکہ میں مقیم ہیں ہواں بھی آنے اُردو کا دامن نہیں چھوڑا اور دیارِ غیر میں اپنی معاشی مسائل سے سمجھوتا کیئے غیر فرصت کے اوقات میں اُردو کی خدمت کرنے کا وہی جذبہ اج تک جاری وساری ہے۔ آپکی کئی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ اور اُردو حلوقں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ یقیناً اب جو کتاب آپکے ہاتھوں میں ہے ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبے حلقے اسے پسند کریں گے۔

عبدالقادر نولگند

پرنسپل

انجمن آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور

ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی کی تحقیقی وتنقیدی جہت

ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی بیجاپور (کرناٹک) کی تہذیب کی جمالیات سے رشتہ رکھتے ہیں۔اس تاریکی سرزمین کے نام ہی سے ماضی کی عظمتوں کی ایک دنیا آباد ہوجاتی ہے۔

ادبی تاریخ کی آنکھوں سے یہ شہر کبھی فراموش نہیں ہوسکتا کہ ادبی کائنات کے کسی نہ کسی حصے میں اس مٹی کا نغمہ گونجتا رہتا ہے اور وہ نغمہ انسانی احساس، روح اور حافظے کا حصہ بن جاتا ہے اور یہی نغمہ پوری ادبی کائنات کا بیجاپور سے رشتہ جوڑتا ہے۔

ڈاکٹر فاروقی بیک وقت ایک محقق، ناقد، ماہر تعلیم اور خوب صورت نثر نگار ہیں جو اپنے تحقیقی و تنقیدی اظہار کے کینوس پر فکر ونظر کے نئے رنگ بکھیرتے جارہے ہیں۔احمد فراز کی شاعری خواب کے آنگن میں خیال کی خوشبو کی ترجمان ہے۔ان کی غزل گوئی چاندنی کی انگلیوں سے پھول کی پتیوں پر شبنم کی کہانیاں لکھنے سے عبارت ہے۔احمد فراز نے زندگی اور معاملات زندگی کو جس نگاہ سے دیکھا وہ صدیوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہے بقول فراق گورکھپوری۔

مجھ سے مت پوچھ مری کیفیتِ قلب و دماغ
میں نے دیکھی ہیں خیالوں کی بھی پُرنم آنکھیں

احمد فراز نے اُردو شاعری کو رومان وانقلاب کے اتنے رنگ اور رس دیئے ہیں کہ یہ بھی مٹ نہیں سکتے۔ان کی شاعری میں انسانی اقدار واخلاقیات پر ٹکنالوجی کے پڑنے والے منفی اثرات کے خلاف سخت تخلیقی ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔یہ مکمل طور پر انسانی احساس واظہار کی شاعری ہے۔ان کی خوبصورت شاعری تغزل سے بھرلب ولہجہ اور کھلی ہوئی آواز اردو شاعری کی آبرو ہے۔انسانی رشتے کی فطری خوشبو نے ہی ان کی شاعری کو تازگی، تابانی، تحرک، توانائی اور تمکنت عطا کی ہے۔فاروقی صاحب کی یہ کتاب احمد فراز کی شاعرانہ عظمت کا موثر ادبی اظہار ہے۔

فاروقی صاحب ایک اچھے اور صاحب طرم نثر نگار ہیں ان کے مضامین میں تحقیق اور تنقید کے پہلو بہ پہلو تخلیقی زبان کا حسن بھی جھلکتا ہے۔ موضوع، محتوبات اور اظہار کی سطحوں پر یہ کتاب ہر طرح کی امتیازی شان رکھتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیر نظر کتاب ادبی اور تہذیبی حلقوں میں پذیرائی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

۵/اپریل ۲۰۱۴ء پروفیسر میر تراب علی یداللہی

حیدر آباد

Prof. Mer Turab Ali Yedullahi
Dept. of urdu
Sawami Ramanand Trith
Marathawada University,
NADED - PARBHANI

کھلا خط

مکرمی ومحترمی پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی صاحب

احمد فراز نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ پشاور میں پلے بڑھے۔ مادری زبان پشتو۔ اردو شاعری کو منفرد لب ولہجہ عطا کرنے والے عصر حاضر کے مایہ ناز شاعر جسکی زندگی جہد مسلسل کا دوسرا نام تھی۔

احمد فرازؔ ایک خاموش سرحدی فریادی کی طرح دردسوزی کے ساتھ اپنے وجدان وشعور کو لیکر غم کی طربناک وادیوں سے گزرتے رہے۔ شدت غم کا شدید احساس ایک شاعر کیلئے اسکا سرمایہ حیات بن جاتا ہے۔ فرازؔ دور حاضر کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل کہلاتے ہیں۔ کرب اور رنج و ملول کی ہمہ گیری میں ڈوبا ہوا ذہن جسکے جمہور میں شعلے نہاں ہیں۔

چراغ جلانا تو پرانی رسمیں ہیں فرازؔ
اب تو تیرے شہر کے لوگ انسان جلاتے ہیں

کسی بلند قامت شاعر کی زندگی اور شخصیت پر قلم اٹھانا کچھ دلچسپ لیکن مشکل، محنت طلب اور بڑی ذمہ دارانہ سعی ہے۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی کو اس رہ گزر پر چلنے کی مہارت حاصل ہے اپنی قوت ارادی بلند خیالی کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ دنیائے ادب کی فضاؤں کو مسلسل معطر کئے جارہے ہیں۔ اپنی ساری نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کی بے لوث اردو خدمات کا احترام کرتی ہوں۔

غوثیہ سلطانہ

شکاگو الی نائے، امریکہ

Ghousia.S.Ghiasuddin
1182, Narragansett Dr.
CAROL STREAM. IL. 60188

پروفیسر عبدالقادر فاروقی ایک باکمال قلم کار

پروفیسر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی صاحب کا نام ادبی دنیا کیلئے محتاجِ تعارف نہیں وہ بحثییت ادبی " گوھرادب "اعجاز مضامین فاروقی" اور "خون جلتا رہا" امریکہ میں انوار اُردو اور شاعری اور تصوف میں اپنے اسلوب کے جوہر دکھا چکے ہیں ان کی زندگی کا بڑا حصہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر زبان وادب کی تدریس میں گذرا ہے فاروقی صاحب انجمن آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور کے صدر شعبہ اُردو و فارسی اور عربی کی صدرات پر فائز رہے تھے 1992 میں امریکہ منتقل ہوئے یہاں وہ نامساعد حالات سے دوچار بھی ہوئے لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ گرم دم جستجو کے سہارے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا حوصلہ بھی پایا اور سلیقہ بھی جو عملی پیاس بیجاپور کے دورانِ ملازمت تشنگی کا شاید احساس دلاتی رہی وہ امریکہ پہنچ کر سیراب بھی ہوتی نظر آتی ہے۔آپ ایک ادبی کی حیثیت سے دوتین نسلوکی ذہنی تربیت کی ہے آج ان کے شاگرد مختلف کالجوں اور یونیورسیٹوں میں زبان وادب کی تدریس خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے احمد فراز کی شخصیت اور شاعری کے کارہائے نمایاں کو کتاب شکل میں محفوظ کیا ان کا یہ کارنامہ لائق ستائش ہے۔

احمد فراز اپنے عہد کے ایک نامور اور نمائندہ شاعر ہیں انہوں نے شاعری کی تمام اصناف میں اپنے افکار کے نقوش ثبت کیے ہیں ان کی غزلوں اور نظموں میں گہری داخلیت نظر آتی ہے وہ حالات وواقعات کا تجزیہ علامتی ومعنوی رمزیت کے ساتھ کرتے ہیں ان کی نظموں میں ان کا باضابطہ ایک فکری نظریہ ہے ان کی شاعری میں ناامیدی، نامرادی، بیکسی یا خرماں نصیبی کی داستان نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری میں داخلی وخارجی حالات اور ان کے احساسات جسم وجان کی طرح لازم وملزوم دکھائی

دیتے ہیں۔

ان کی غزلیں اور نظمیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ عام روش کی شاعری سے مختلف ہیں ان کی اپنی انفرادی شان ہر جگہ قائم ہے انہوں نے غزل کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے ان کی بیشتر علامتیں ہماری شعری روایت سے جڑی ہیں باوجود اس کے وہ عام روش سے الگ ہیں احمد فراز کی علامتوں کی معنویت بالکل نئی ہے اس لئے بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا لہجہ ان کی آواز ان کا انداز بیان مروجہ نظموں اور غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ان کے ذریعہ استعمال کئے گئے الفاظ نئی معنومیت لئے ہوئے ہیں جو عام شعراء کے یہاں نہیں ملتے ان کی سلیقہ مندی ان کا بیباک لب ولہجہ اظہار کا انداز اُردو شاعری میں انہیں ایک اعلیٰ اور برتر مقام عطا کرتا ہے احمد فراز نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں وافر کلام پیش کیا ہے جس میں کلاسیکیت سے جدیدیت تک کے انداز واسلوب پائے جاتے ہیں یہی نہیں انہوں نے اُردو کے آکثر شعراء کی طرح زیادہ تر توجہ نظم پر ہی دی تھی اور اس میں اپنے فنی جوہر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے اُن کی بعض غزلوں اور نظموں کے کئی اشعار تو ہمیں متاثر ہی نہیں کرتے بلکہ دل پر نقش ہوکر رہ جاتے ہیں جیسے

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

احمد فراز کی نظموں اور غزلوں کی خاصیت یہ ہے سچی بات کہتے وقت لہجے میں جو تاثر ہوتی ہے وہ ان کے لہجے میں موجود ہے کسی بھی شاعر کی انفرادیت اس کے طرز بیان سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ

شاعراورادیب تو بہت ہوتے ہیں لیکن شہرت کے بام پر چند ایک ہی پہنچ پاتے ہیں ان میں احمد فراز کا نام بھی شامل ہے۔

احمد فراز کی سہل ممتنع شاعری کی انسان کے ذہن ودل کو تسخیر کرنے کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

مجھے پروفیسر عبدالقادر فاروقی صاحب کو قریب سے دیکھنے اوران کی تخلیقات پڑھنے اور سننے کا شرف حاصل ہواان کی یہ ادبی سماجی علمی خدمات نا قابل فراموش ہیں ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ احمد فراز کی شخصیت اور شاعری کے تمام اہم پہلوں پر روشنی ڈالی ہے اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتے ہوئے متوقع ہوں کہ اُردو دنیا میں یہ کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

شعبہ اردو، انجمن آٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج

بیجاپور

احمد فرازؔ شخصیت اور شاعری

پروفیسر خالدہ ظہور

محترم ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی علم و ادب اور تحقیق سے تعلق رکھنے والے ایسے فرزانوں میں شامل ہیں جو مستقل محنت کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ قلم کے ایسے مزدور ہیں جو کبھی مزدوری کے طلب گار نہیں ہوئے۔ ان کی مزدوری وہ اطمینان اور روحانی مسرت ہے جو اپنی تصنیف کردہ کتابوں کو دیکھ کر انہیں حاصل ہوتی ہے۔ سچ ہے جس نے کتابوں سے دوستی کرلی اُسے پھر کسی اور طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ اس سحر سے نکل ہی نہیں سکتا علم کا ایک اپنا لطف، اپنا ذائقہ اور اپنی دنیا ہے۔ لکھنا اور مسلسل لکھتے رہنا ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے اور اسی سے وہ فقیری میں امیر ہیں۔ ان کی گرہ میں بے شمار کتابوں کا خزانہ بندھا ہے جو انہیں نیویارک کے اہلِ علم میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب احمد فرازؔ شخصیت اور شاعری ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی تازہ تصنیف ہے۔ مشہور و معروف شاعر احمد فرازؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بلکہ یہ اردو شاعری سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مستقل مضمون ہے جس کو سو رنگ سے باندھا جاتا رہے گا۔ کیونکہ فرازؔ کے معنی بلندی کے ہیں اور بلندیوں پر رہنے والے ایک عالم کو دیوانہ بنائے رکھتے ہیں۔ فرازؔ نے ایک رومانوی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے ادبی اور عوامی سطح پر جو مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے ان کا کلام دل کے ہر پہلو میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ احمد فرازؔ نے اپنے طویل ادبی سفر میں شروع سے آخر تک اپنے معیار کو برقرار رکھا اور اپنی تخلیقی صلاحیت کو زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔ فرازؔ نے ایک جگہ لکھا ہے "صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے"

فرازؔ نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "تنہا تنہا" سے لے کر آخری شعری مجموعہ "اے عشق جنوں

پیشہ " تک رومانیت کے ساتھ ساتھ حریتِ فکر اور ناموسِ قلم کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔تیس برس تک پاکستان میں فرازؔ سے زیادہ کوئی شاعر اپنی تخلیقات پر رائلٹی وصول نہیں کر سکا اس کے شعری مجموعوں کی فروخت کا ریکارڈ کوئی شاعر نہیں توڑ سکا۔ وہ فن کا سمندر ہے، لفظوں کا جادوگر ہے، محبتوں کا امین ہے۔ خوابوں کا بادشاہ ہے اور زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ گر بھی بقول فرازؔ

تیرے غم نے میرے وجدان کو بخشی وہ کسک
میرے دشمن، میرے قاتل، میرے احباب نثار

کسی بڑی شخصیت پر قلم اٹھانا شہادتِ گیہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور احمد فرازؔ کی شخصیت اور شاعری کا اپنے انداز اور اپنے رنگ میں جائزہ لیا ہے بقول سوداؔ

؎ کیا جانے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

ڈاکٹر فاروقی کی محنت شاقہ اس کتاب میں بھرپور انداز میں متاثر کرتی ہے۔ کتاب کو ابواب میں اسطرح تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) سفرِ زندگی
(۲) احمد فرازؔ کی شخصیت
(۳) دنیا کی حقیقت احمد فرازؔ کے نزدیک
(۴) احمد فرازؔ کی شاعری
(۵) احمد فرازؔ کے منظوم ڈرامے
(۶) احمد فرازؔ کے ڈراموں سے انتخاب

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نے احمد فرازؔ کی ابتدائی زندگی کے تعارف سے کتاب کا آغاز کیا

ہے کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس کے ابتدائی ماحول و معاشرت اور خاندانی حالات کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ بعدازاں فاروقی صاحب نے احمد فرازؔ کے مزاج کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور اُن کے ذہنی رجحانات اور فلسفۂ حیات سے روشناس کروایا ہے۔ اور فرازؔ کے کلام میں سے اُن چیدہ چیدہ اشعار کو پیش کیا ہے جو کسی خاص نکتۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں علاوہ ازیں فرازؔ کی شاعری کا انتخاب بھی شامل کتاب کیا ہے۔ احمد فرازؔ نے ریڈیو کے لئے منظوم ڈرامے بھی تحریر کئے تھے فاروقی صاحب نے اُن ڈراموں کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس کے لئے انہیں تلاش اور جستجو کے مراحل سے گذرنا پڑا ہوگا جو کہ بجائے کو دایک مشکل امر ہے۔ آخر میں "سپارہ اور موت" کے نام سے ایک طویل ڈرامے کو احمد فرازؔ کے ڈراموں سے انتخاب کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی جامعیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فاروقی صاحب کا اندازِ بیاں شستہ رواں اور عام فہم ہے۔ جس سے قاری کو مفہوم تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی ادبی و علمی لگن نے انہیں کبھی بے عمل نہیں ہونے دیا۔ ان کی شبانہ روز محنت کسی نہ کسی کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ اگرچہ کارِ جہاں دراز ہے مگر ہم امید رکھتے ہیں کہ فاروقی صاحب کا کاروانِ شوق اسی طرح رواں دواں رہے گا بقولِ فرازؔ

وقت آیا تو میں مقتلِ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے

پروفیسر خالدہ ظہور

اسٹینٹ پروفیسر۔ شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، کوئٹہ۔ زرغون روڈ۔ بلوچستان

نائب صدر۔ حلقہ اربابِ ذوق نیویارک

Address:- Prof. Khalida Zahoor
2155, Coney Island Ave Apt# 2R
Brooklyn, NY-11223

ذرا جلدی نہیں کردی

ڈاکٹر صبیحہ صبا (نیویارک)

فراز!

اللہ تجھ کو رحمت میں سدا رکھے!

چلو جانا تو سب کو ہے، مگر پھر بھی یہ لگتا ہے، ذرا جلدی نہیں کر دی

بہت سے کام ہونا تھے

ابھی تو شوق کے آہوئے وحشی کو تجھے زنجیر کرنا تھا

زباں کو تیر کرنا تھا

سنہرے خواب کو تعبیر کرنا تھا

تجھے اے بھولنے والے!

ابھی تو اپنی "ضدی نظم" سے عفریتِ استبداد کو "محصور" کرنا تھا

شب تاریک کو پر نور کرنا تھا

ابھی سہمے ہوئے لوگوں کے دل سے خوف، آنکھوں سے اندھیرا دور کرنا تھا

بہت سے کام باقی تھے!

ابھی تو ذہن کے آنگن میں غزلوں کی نئی رنگین پریاں ناچتی گاتی اترنا تھیں

تجھے فرصت نہ تھی، ان سے مگر باتیں تو کرنا تھیں

مگر تو کم سخن اپنی ہی مرضی کا

ابھی تو گیسوئے اردو کو سلجھانا بھی باقی تھا

ابھی تو کاکل پیچان فن میں شانہ۔ معنی کو الجھانا بھی باقی تھا

ابھی تو اک نئی فرہنگ لکھنا تھی

ابھی تو داستان نغمہ و آہنگ لکھنا تھی

گلوں کے مشورے سے شرط کسب رنگ لکھنا تھی

صبا کے سنگ لکھنا تھی

مگر تو حیلہ گر اپنی ہی مرضی کا!

ابھی تو دوستوں کے ساتھ کچھ ہنسنا ہنسانا تھا

انہیں سننا سنانا تھا

ابھی تو حسب وعدہ حافظ و سعدی پہ کوئی بات ہونا تھی

زبانِ پہلوی کے کچھ نئے پہلو دکھانا تھے

متاع غالب و بیدل سے کچھ ہلنا ہٹانا تھا

بہت سے کام باقی تھے

ابھی تو سیکھنے والے، تری محفل کے متوالے، گھروں سے آنے والے تھے

ابھی تو دور افتادہ جزیروں پر، تری آمد کا پھر جشن ہونا تھا

کسی کو نیند آنا تھی، نہ اتنی دیر تک جاگے ہوئے لوگوں کو سونا تھا

ابھی تو سال خوردہ، نوجواں، بچے

دیار غیر میں رہ کر وطن کو یاد کرنا چاہتے تھے

ری نظمیں تری غزلیں، براہِ راست بس تجھ سے ہی سننا چاہتے تھے

نگاہ و دل میں تجھ کو بے وفا!

آباد کرنا چاہتے تھے

ذرا سی دیر آنکھوں کو مزین

ذہن و دل کو شاد کرنا چاہتے تھے

مگر تو بادشا اپنی ہی مرضی کا!

ادھر آیا کوئی پیغام رنگیں

اور تو محفل سے اٹھ کر دوسری جانب چلا

آتا تو کچھ سرگوشیاں ہوتیں

نئی کچھ جنتری بنتی

مگر تجھ کو تو پہلی ممکنہ پرواز سے جانا ہی ہوتا تھا

ستم ڈھانا ہی ہوتا تھا

نئے قریے، نئے کوچے، نئے احباب

ستم ڈھانا ہی ہوتا تھا
نئے قریے، نئے کوچے، نئے احباب
تیری دید کے مشتاق جو ٹھہرے
تیرے عشاق جو ٹھہرے
بہانہ جو کہیں کا!
تجھے اے زود گر
یونہی سحر کو شام کرنا تھا
ذرا آرام کرنا تھا
تجھے جلدی بہت تھی میکدے سے اٹھ کے جانے کی
تو شہر، بادہ کش، اپنی ہی مرضی کا
تجھے خالی یونہی اس زندگی کا جام کرنا تھا
مگر پھر بھی یہ لگتا ہے
ذرا جلدی نہیں کر دی!
ذرا جلدی نہیں کر دی!

ڈاکٹر محمد شفیق سے گفتگو

شمالی امریکہ کی معزز شخصیات ڈاکٹر محمد شفیق اور ڈاکٹر رفیق جانؔ جن کا تعلق احمد فرازؔ سے بہت گہر رہا ہے۔ اور احمد فرازؔ کے نزدیک ڈاکٹر شفیق اور ڈاکٹر رفیق کے لئے بہت ہی عزت اور احترام تھا۔ احمد فرازؔ نے ان دونوں معزز شخصیات کے خلوص کے احترام میں مجموعہ کلام "شب خون" ڈاکٹر محمد شفیق کے نام منسوب کیا اور منظوم ڈرامہ "بودلک" ڈاکٹر رفیق جان کے نام۔

راقم الحروف کے نزدیک ڈاکٹر محمد شفیق اور ڈاکٹر رفیق جان معزز اور قابل احترام ہیں انصاف تو یہ تھا کہ دونوں معزز شخصیات سے گفتگو کی جائے مگر راقم الحروف کی یہ تصنیف "احمد فرازؔ شخصیت اور شاعری" ان کے اردو ادبی خدمات پر ہے یہی وجہ سے ڈاکٹر محمد شفیق سے گفتگو کی۔

ڈاکٹر محمد شفیق، صدر حلقہ ارباب ذوق، نیویارک شاعر، ادیب، کالم نگار، نقاد، دانشور کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی جدو جہد کے علم بردار ہیں۔ شمالی امریکہ کے اکثر اردو اخبارات ڈاکٹر محمد شفیق کے غور و فکر کے کالموں سے آراستہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد شفیق کو شرف حاصل ہے کہ وہ احمد فرازؔ کے میزبان رہے ہیں۔ اس گفتگو کا مقصد یہی ہے کہ میزبان بھی شاعر اور ادیب اور مہمان بھی اسی مقصد سے ڈاکٹر محمد شفیق سے گفتگو کے لئے گذارش اور اجازت طلب کی ان کی پر خلوص اجازت اور ان سے گفتگو راقم الحروف کی تصنیف کو اہمیت بخشی۔ جس کے لئے ڈاکٹر محمد شفیق کا شکر گذار ہوں۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ پیشے کے لحاظ صحت اور زندگی کے معالج اور آپ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ آپ کی مادری زبان اردو نہیں ہے مگر آپ بصیرت سے پُر آپ کی اردو شاعری، اور اردو اخبارات میں آپ کے کالم اردو ادب میں ایک خاص اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں آپ کا قدم اردو کی طرف کیسے بڑھا؟

جواب:۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے۔ ہاں میرے والد مرحوم کو اردو اور فارسی پر کافی عبور حاصل تھا۔ کبھی کبھی کوھستان اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے۔ سیاسی نامہ لکھنا اُن کا خاصہ تھا۔ ان سے بالواسطہ تو اردو نہیں سکھی۔ لیکن ان کا لکھا پڑھ لیتا تھا۔ اور مشکل معنی جاننے کی کوشش ضرور کرتا۔

سوال:۔ احمد فرآز ہم سے رخصت ہو چکے بحثیت میز بان کے آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب:۔ فرآز صاحب کے انتقال سے پہلے ہر سال ان سے ملاقات ہوتی تھے۔ اور جب بھی وہ وقت آتا ہے تو ایک عجیب نوعیت کی اُداسی ہوتی ہے ان سے گفتگو ایک طرح سیکھنے کا عمل ہوتا تھا۔ اور ساتھ ایک اچھے دوست بھی تھے۔

سوال:۔ احمد فرآز جب آپ کے دولت کدہ پر قیام پذیر تھے بحثیت مہمان آپ نے ان کو کیسے پایا؟

جواب:۔ ان سے تعلق تھا جیسے گھر کا فرد علی الصبح اُٹھتے چائے اپنے لئے ایک مخصوص انداز سے بناتے اپنے کپڑوں کی استری خود کرتے۔ ایک دفعہ میں نے کرنے کی کوشش کی تو کہنے لگے کہ آپ کو استری کرنا نہیں آتا۔ دیکھو اپنے پینٹ اس میں ڈبل لائنس آئی ہیں۔ چونکہ چند دنوں کی مہمان نوازی ہوتی اور وہ کھانے وانے میں احتیاط برتتے تھے۔ پُر مزاح انسان تھے ان کی شاعری اور ان کی پرائیویٹ گفتگو کا جوڑ کم ملتا تھا جب کسی فورم پر بولتے تو وہ رنگ سامنے آجاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مزاح بھی ادب کا حصہ بن سکتا ہے اگر اس کو مجتمع کیا جائے

سوال:۔ آپ کی جب بھی شاعری اور ادب پر احمد فرآز سے گفتگو ہوتی تھی آپ احمد فرآز سے گفتگو میں ہم خیال ہوتے یا کبھی مخالفت بھی ہوتی تھی؟

جواب:۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے وہ اس لئے کہ فرازؔ صاحب اوزان کا خاص خیال کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی تلفظ کی ادائیگی میں غلطی ہو جاتی ایک دفعہ تو یوں ہوا کے میں نے ایک شعر نشست میں پڑھا شعر یوں ہے۔

چشم پوشی کی سزا مجھ کو شفیق ایسی ملی

سب نقب زن شہر کے میرے مکان تک آگئے

واپسی پر انہوں نے مقطع دہرانے کو کہا جب میں نے سنایا تو کہنے لگے کہ یہ نقب زن نہیں نقّب زن ہے میں نے مصرع کی تصحیح تو اُسی وقت یوں کی

؎ نقُب زن سب شہر کے میرے مکان تک آگئے

لیکن ساتھ ساتھ ان کو یاد دلایا کہ یہ تلفظ میں نے آپ کے محاصرہ نظم سے سیکھا ہے۔ وہ مصرع کچھ یوں ہے۔

؎ میرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس

خیر انہوں نے اپنی نئی ایڈیشن میں اس کی تصحیح کری ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ جانتے نہیں تھے۔ انہوں نے دوسرے اشعار میں صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ایک دفعہ گفتگو کے دوران انہوں نے دعویٰ کیا کہ کوئی بھی لفظ وہ کسی بھی بحر میں فٹ کر سکتا ہے۔ میں نے تھوڑا اس دعویٰ پر سوچا پر مجھے شرارت سوجھی اور ان سے استدعا کی کے فرازؔ صاحب لفظ "مستقبل" کو اپنی رس زمین میں استعمال کر کے دیکھائیں۔

"اس نے سکوت شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا"

تھوڑی دیر کے بعد ہنس کے ہاتھ اُٹھائے کہ میاں مان گئے۔ نہیں آسکتا ایسے ایک دفعہ ایک

واقع بیان کر رہے تھے کہ ایک دفعہ ان کی صدارت میں غالبؔ کی غزلوں کے ترجمے پر جو ایک بریگیڈا نے کیا تھا پروگرام تھا۔ تو فرازؔ نے بتایا کہ ترجمہ بڑا بھونڈا تھا۔ دل ناداں کا ترجمہ stupid Heart کیا تھا اور پھر کہنے لگے کہ انگریوی میں اس سے بہتر لفظ ہے ہی نہیں خیر میں نے ان کو کہا کہ فرازؔ صاحب کے ایک خوبصورت لفظ ہے۔ بڑی حیرانگی لیکن پورے اعتماد سے پوچھا کہ کیا ہے۔ کہ ناداں کے لئے لفظ "Naive" ہے بہرِ صورت ان کے ساتھ نوک جھونک ہوتی تھی۔ اکثر وہ ہی جیت جاتے تھے۔ پر ایک طرح میرے سیکھنے کا عمل تھا۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ معالج صرف صحت اور زندگی کے ہیں بلکہ شاعری اور ادب کے ساتھ آپ کی سیاسی بصیرت بھی روشن ہے۔ جب آپ کے دولت کدہ پر احمد فرازؔ سے سیاسی گفتگو ہوتی تو آپ تاثرات کیا ہوتے اور احمد فرازؔ کی سیاسی غور و فکر سے آپ کیا رائے قائم کرتے؟

جواب:۔ حقیقت میں ان کے ساتھ سیاسی گفتگو کا محور بھی ہوتا تھا۔ چونکہ ذہنی طور پر ان تحریکوں سے وابستہ رہتے تھے۔ لہٰذا ان کے ساتھ دوستی کا BOND ہی یہی تھا بلکہ ایک دو دفع ان کے ساتھ گرما گرمی بھی ہوئی۔ اس کے وجہ جنرل مشرف سے صدارتی ایوارڈ حاصل کرنے کا تھا۔ مجھے کچھ اندر سے تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ یہ

ایوارڈ پی پی حکومت سے Expect کر رہے تھے۔ ویسے ان کو ایوارڈ حاصل کرنے سے روحانی خوشی نہیں تھی۔ انہوں نے یہی کرنا تھا کے واپس کر دیا۔ وہ پشتو کا ایک مقالہ سناتے تھے۔ کہ آپ کی یہ عادتیں ہوں اور میرے ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ تو ایک دن ضرور الجھیں گے۔ اور وہی ہوا کہ مشرف کے ساتھ الجھ گئے اور ایوارڈ واپس کر دیا۔ مجھے ان سے تھوڑی سی ناراضگی اس لئے ہوئی کہ

میں نے ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق کے ساتھ نیویارک میں تو تو میں میں کی۔ فرازؔ صاحب کو اسلام آباد میں علم ہوا اور اس کے جواب میں اعجاز الحق کے کہنے پر حفصہ مسجد کے عملے نے بکر فاؤنڈیشن کی زمین پر قبضہ کرلیا۔ اور وہاں سے یہ سارا معاملہ آگے بڑھا۔ فرازؔ چونکہ میرے ان بن کے نتیجے سے خوش نہیں تھے۔ لہٰذا میرے ساتھ ان کی بحث ہوئی اور میں نے ان کو یاد دلایا کہ آپ نے بھی دوبئ میں اعجاز الحق کی موجودگی میں مشاعرہ پڑھنے سے انکار کیا تھا۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب احمد فرازؔ کی شاعری آپ کے نزدیک؟

جواب:۔ اس کا جواب بہت سیدھا سادھا ہے۔ نظم کے بارے میں میری دوسری رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن غزل میں غالبؔ کے بعد فرازؔ صاحب کو سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔

سوال:۔ احمد فرازؔ کی شخصیت آپ کی رائے؟

جواب:۔ وہ ایک بے حد رحم دل انسان تھے غریبوں کی مدد کرتے نقادوں اور افواہ نگاروں کے بارے میں کہتے کہ میری شخصیت کے بارے میں ان سے پوچھو جن کے ساتھ میرا روزمرہ کا تعلق ہوتا ہے۔ جاب یعنی ملازمت کے حوالے سے بڑے ڈیسپلین تھے۔ اپنی اہلیت پر آگے بڑھے کہیں بسیاکھیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے ہر پائی دیانت داری سے کمایا ہے۔

سوال:۔ احمد فرازؔ کے چاہنے والوں کا کوئی واقع؟

جواب:۔ ایسے تو بہت سے ہیں لیکن ایک انڈین پروفیسر تھی جو کلکتہ سے تھی۔ لیکن U.P. ان کی جائے پیدائش تھی۔ سان فرانسیکو میں پڑھاتی تھی۔ فرازؔ صاحب کی بڑی فین تھی۔ دلچسپ بات بلکہ نہ ماننے والی بات ہے کہ فرازؔ صاحب کی ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی صرف فون پر گفتگو ہوتی۔ وہ حتی الوسیع اُسی مشاعرہ میں آتی جس میں فرازؔ صاحب ہوتے۔ لیکن خود کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس

پروفیسر کا نام سُلیکھا تھا۔ فرازؔ صاحب مزاقاً ان کو زلیخا کہتے تھے۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟

جواب:۔ ان کے ساتھ نیویارک میں پہلی ملاقات عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ اگرچہ اور حضرات ان کو اپنے ساتھ لینے آتے تھے۔ اور یہ سچ ہے کہ میزبان بننے کے شوق میں ادھر نہیں گیا تھا۔ بلکہ ان کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا شوق تھا۔ لیکن انہوں نے سب کے سامنے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سب سے معذرت کر دی کہ میں تو ان کے ساتھ جاونگا پھر اس دن سے ان کے ساتھ ان کی آخری لمحات تک ایک مضبوط تعلق رہا۔

ڈاکٹر صاحب آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ کی خوش طبعی سے آج کچھ سیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ نیویارک میں احمد فرازؔ سے گفتگو کے دوران یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کے ادبی خدمات پر مقالہ لکھنے کی اجازت اور وہ مسکراتے ہوئے کہے کہ مقالہ ہی نہیں کتاب لکھیں مگر ہر ایک کو سفر زندگی مکمل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے سفر زندگی میں یہ موقع عنایت فرمایا ڈاکٹر صاحب آپ سے گفتگو وہ گرانمایہ سرمایہ ہے احمد فرازؔ کی ادبی اور شخصی زندگی کا جسے قاری قابل قبول اور قابلِ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

سفرِ زندگی

سفرِ زندگی

ذرّے ذرّے مین ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

چھین کر اپنی زندگی پالے
موت کی بھیک مانگنے والے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لئے رُکنا ہے گزر جانا ہے

سیداحمد شاہ قلمی نام شرر برقؔ اردو تخلص

"فرازؔ" ۱۲رجنوری ۱۹۳۱ء نوشیرہ کوہاٹ مین پیدا ہوئے اور سفرِ زندگی میں قدم رکھا: احمد فرازؔ کے والد سید شاہ محمد برقؔ معروف معلم اور فارسی کے معروف شاعر تھے۔ احمد فرازؔ سی اعلیٰ مہذب عربی، فارسی اور اردو ادبی ماحول میں پرورش پا کر طالب علمی کے دور سے ہی اپنی شاعری کا آغاز کیا اور ان کے بے باک اور بے قرار قلم اُسی وقت رُک گیا جب وہ ۲۵ راگست ۲۰۰۸ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے اور فرمایا۔

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگون کی
مرا قلام تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

قلم

تعلیم اور ملازمت کے سفرمین ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہاسکول کوہاٹ سے اور پھر بی۔اے۔ یم۔اے اردو و فارسی میں پیشاور یونیورسٹی سے مکمل کی یم۔اے۔کے بعد پیشاور یونیورسٹی مین اردو لکچرار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ریڈیو پاکستان اور دیگر سرکاری عہودوں پر بھی رہتے خدمات انجام دی۔

احمد فرآز اپنے ادبی سفر مین شاعری کی ابتداء طالب علمی کے دور سے ہی کی تھی۔احمد فرآز کے والد خود اردو اور فارسی کے ماہر اور شاعر تھے جس کی وجہ سے احمد فرآز میں ادبی اور فنی خوبیاں انہیں وراثت میں ملی تھیں۔احمد فرآز مرزا غالب اور مرزا بیدآل سے بہت متاثر تھے اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند تحریک کے شعراء کرام فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری کی شاعری ان کے سامنے نمونہ تھی۔ احمد فرآز کے تیرہ مجموعہ شائع ہو چکے ہیں ان تمام مجموعہ کو حکایات کی شکل میں "شہرِ سخن آراستہ ہے" شائع ہوئی تمام مجموعہ اسطرح ہیں۔

تنہا تنہا

درد آشوب

نایافت

جاناں جاناں

شبِ خون

میرے خواب ریزہ ریزہ

بے آواز گلی کوچوں میں

نابینا شہر میں آئینہ

پس انداز موسم

سب آوازیں میری ہیں

خواب گل پریشاں ہے

بودلک

غزل بہانہ کروں

احمد فرآز کے ادبی خدمات پر جو اعزازات سے نوازا گیا ہے ان میں

۱۹۷۳ء --- دھنک ایوارڈ

۱۹۷۳ء --- ٹاٹا ایوارڈ جمشید نگر ہندوستان

۱۹۸۸ء --- فراق گورکھپوری ایوارڈ --اباسین آرٹس کونسل لاہور

۱۹۹۱ء --- لٹریری انٹرنیشنل ایوارڈ

۱۹۹۲ء --- اکیڈمی آف لٹریچر ایوارڈ ٹورنٹو کینڈا

۱۹۹۴ء --- نقوش ایوارڈ

۱۹۹۴ء --- ستارہ امتیاز ایوارڈ

۱۹۹۵ء --- ڈاکٹر آف لٹریچر ازازی ڈگری، کرانی یونیورسٹی

۲۰۰۴ء --- ہلال امتیاز

۲۰۰۶ء --- احمد فرآز نے "ہلال امتیاز "ایوارڈ واپس کر دیا اور کہا کہ جہاں انسان کے حقوق اور اس کی آزادی کو پامال کیا جائے اور یہ فرمایا کہ ' آئندہ میں جو بھی لکھوں گا وہ اپنی ضمیر کی آواز سے لکھوں گا۔

کہ شاعری بھی تو جزو پیمبری ہے فرآز
سو رنجِ خلق خدا صورت پیمبر کھینچ

وہ حرف لکھ کہ بیاضِ سخن لہو سے سجے
قلم سے رشتہ کی صورت لکیر دل پر کھینچ

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقین ہے مجھے
کہ یہ حصار ستم کوئی تو گرائے گا

تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فرازؔ
گل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم

احمد فراز

آج سے میرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس مین اُتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلّم ہے پکاروں گا تجھے

احمد فراز کی شخصیت

احمد فرازؔ کی شخصیت

انسان کی شخصیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح انسان رنگ ونسل، زبان و ادب، تہذیب و مذہب، عادات واطوار، رہن وسہن، عقل وشعور، غور وفکر، قوم وقبیلہ، خطہ وملک تعلیم و تربیت میں مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ تمام اسی دنیا میں ہوتی ہیں جہاں انسان آباد رہتا ہے۔ دنیا کا رشتہ ہر معمہ انسان سے رہتا ہے۔ امیدیں و آرزویں غم وخوشی، اچھائی و برائی، نیکی و بدی، کامیابی اور ناکامی، مفلسی اور امیری، عشق ومحبت، رشتے ناطے، دوست و دشمن، انسان کی زندگی دنیا ہی میں گذرتی ہے اور وہ زندگی بھر دنیا سے نبرد آزما رہتا ہے۔

شکست و فتح مرا مسئلہ نہں ہے فرازؔ
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

دنیا کی حقیقت احمد فرازؔ کے نزدیک

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

منزلین ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں

کوئی مکاں کوئی زنداں سمجھ کے رہتا ہے
طلسم خانئہ دیوار و در کو دیکھتے ہیں

فرازاس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے
یہ شہر سحر زدہ ہے صدا کسی کی نہیں
یہاں خود اپنے لئے بھی دعا کسی کی نہیں

دنیا حالات، واقعات اور حادثات کی مجموعہ ہے جس کے ردِ عمل سے انسان میں جو احساسات اور جذبات جنم لیتے ہیں تبدجس اس کے شعور و عقل، غور و فکر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور جب یہی تبدیلی ادب اور فن کے ذریعہ رونما اور منکشف ہوتی ہے تو شاعر، ادیب اور فنکار کی شخصیت کو اُجاگر کرتی ہے شخصیت انسان کے باطن اور اس کے روح کی تڑپ اور اظطراری کیفیت کا نام ہے۔

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

جب روح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے
احساس کی لَو اور بھڑک جاتی ہے
میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

شاعر اور ادیب دنیا کی حقیقت اور اس کے ردعمل سے انسان کی روح اور باطن کو بیدار اور سچائی اور حقیقت سے آگاہ کرتا ہے تو دنیا اس کا بدلہ اس طرح دیتی ہے۔

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھُولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے
تم پیمبرنہ تھے عرش کے مُدّعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
اور زمانے سے تم کو صلیبیں مِلیں

ادب میں شاعراورادیب کی شخصیت اس کی تخلیق میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ابتداء ہی سے تہذیب وتمدّن کے فروغ اوراس کے نشو ونما میں ادب کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ادب نہ صرف انسان کے ظاہری بلکہ باطن کی بھی بیداری کا ذریعہ ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ باطن کی بیداری ظاہرکوتبدیل کر کے رکھتی ہے۔اوراگر شاعراورادیب کےفن میں خاموشی اور بیداری نہ وہ تو اس کا اثر تہذیب وتمدن پر بھی ہوگا۔اورظلم و بربریت میں نہ صرف انسان بلکہ اس کی تہذیب وتمدن کا بھی خاتمہ ہوگا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بغیر روح بیداری اور زندگی کے فن نہیں کہلاتا۔

فنکار جو اپنے سحرِ فن سے
پتّھر کو زبان بخشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدا میں
آواز کو جان بخشتا ہے
تاریخ کو اپنا خون دے کر
تہذیب کو شان بخشتا ہے

فنکار خموش ہو تو جابر
ظلمت کے نشان کھولتا ہے

ہر اہلِ نظر کو دستِ قاتل
نیزے کی اَنی پہ تولتا ہے
انساں بزورِ خاک و خوں میں
انساں کے حقوق رولتا ہے

فنکار اگر زباں نہ کھولے
انبارِ گہر نصیب اِبلس کا
ورنہ ہر شہر یار دشمن
ہر شیخِ حرم رقیب اُس کا
چاہے وہ فرازؔ ہو کہ نذرل
بولے تو صلہ صلیب اُس کا

ہر شاعر اور ادیب کی شخصیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ شاعر اور ادیب زمانے کے اثرات تو ضرور قبول کرتا ہے۔ چاہے وہ ماضی کے ہوں یا حال کے۔ مگر اس کے عقل و شعور، غور و فکر کی گہرائی اور گیرائی مختلف ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کا معیار بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کی تخلیق ہی اس کی شخصیت کی ضامن ہوتی ہے۔۔ یعنی شاعر اور ادیب کی شخصیت اس کے غور و فکر کی گہرائی اور گیرائی سے رونما ہوتی ہے۔ زمانے کے حالات، واقعات اور حادثات کے ردعمل سے اس کے فن میں بھی تبدیلی کا ظہور ہوتا ہے۔

احمد فرازؔ نے ادب میں شاعری کے ذریعہ قدم رکھا اور ان کے یہ احساسات اور جذبات کچھ اس طرح تھے۔

وہ بھی کیا دن تھے جب فرازؔ اس سے
عشق کم عاشقی زیادہ تھی

میں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکرای ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رخِ یار کہوں

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، برسرِ عام رکھ دیا

ہر کوئی تیری داستاں انجمن انجمن کہے
اَب کے ترے فراق میں ہم نے عجب سخن کہے

گفتۂ یار پر فرازؔ کس طرح حرف گیر ہُوں
ہم نے بھی اُس سے بارہا جھوٹ ضرورتاً کہے

دونوں کو زعم، عشق ہے لیکن اس اختلاف سے
میں اُسے جسم و جاں کہوں تو اُسے پیرہن کہے

یہ میں بھی کیا ہوں اُسے بھُول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اُسی کا رہا

وہ بت کہ دُشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو دَر اُسی کا رہا

شعلہ سا بدن زلف کی مخمل میں لپیٹے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
پھر بھی اپنے عہد پر قائم ہیں ہم اپنی جگہ

محفلِ جاناں ہو، مقتل ہو کہ میخانہ فرازؔ
جس جگہ جائیں بنا لیتے ہیں ہم اپنی جگہ

ہم ہمیشہ کے سیر چشم سہی
تجھ کو دیکھیں تو آنکھ بھرتی نہیں

شبِ ہجراں بھی روزِ بد کی طرح
کٹ تو جاتی ہے پر گزرتی نہیں

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
گر مجھے ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وہ شمع کہ پتّھر کی بھی پروا نہ کرے
میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگئ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

یہ مسئلہ اب اہلِ محبت کا ہے اپنا
مرتے ہیں تو کچھ آپ پہ احساں نہیں کرتے

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

خط لائیں نہ لائیں ترا، ہم نامہ بروں کو
بس دیکھتے رہتے ہیں پریشاں نہیں کرتے

بیسوی صدی انسانی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس میں دو علمی جنگیں لڑی گئیں ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم جس سے کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن گئے اور یہ سلسلہ جاری ہے روس اور برطانیہ علمی قوتوں کا زوال امریکہ واحد علمی قوت بن کر ابھرنا، نسلی و مذہبی تعصب ارنفر کظوں کی اس طرح تقسیم جس کا کوئی حل نہ ہو، آزادیِ انسان اور جمہوریت کے پرچم کے نیچے اپنی قوت اور طاقت سے قوموں اور ملکوں کو

غلامی اور محکومی مین جکڑنا مفاد پرست انسانوں کے ذریعہ اپنی حاکمیت قائم کرنا، مذہبی ٹھیکیداروں کے ذریعہ نفرت، تعصب، تفریقہ اور تباہی معاشرتی اور تہذیبی گراوٹ، تجارت کے لئے جنگ کو جائز قرار دینا، قوموں اور ملکوں میں معاشی تباہی کے ذریعہ معاشی مجبوریوں کو فروغ دینا تا کہ دولت مند طبقے کے غلام بنے رہے۔ بیسوی صدی میں انسان ترقی کی معراج پر پہنچ کر چاند اور ستاروں کو تو دیکھا مگر زمین پر بکھری پڑی سڑی ہوئی اور بد بودار انسانوں کی لاشوں کو دیکھ نہیں سکا۔ اور نہ ہی انسان کی بھوک اور پیاس کو محسوس کیا۔ نفرت تعصب بر بریت، ظلم، آمریت اور حاکمیت، مجبوری ومحرومی بیسوی صدی میں بھی داخل ہوگی۔

بیسوی صدی نے احمد دفراز کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا احمد فراز کے اطراف نفرت تعصب، آصریت اور حاکمیت، مجبوری اور محرومی، ظلم اور بر بریت، غلامی اور محکومی، تمام دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ یہی احساس اور جذبہ تھا جس نے انہیں بے قرار کر دیا اور وہ تڑپ اُٹھے۔

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس ٹمِ ذات میں گم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناگ پکاریں
لیکن مرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
مَیں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور
جام دمے و مینا و خاراہات میں گم تھا

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی

شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوقِ سخن تھا
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
اور اِس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر
قاتل کو پکارا کبھی مقتل میں صدا دی
گاہے رسن و دار کے آغوش میں جھولے
گاہے حرم و دَیر کی بنیاد ہلا دی
جس آگ سے بھر پور تھا ماحول کا سینہ
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلادی

اور آج شکستہ ہوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

قوموں اور انسانوں کی خود پرستی اور مفاد پرستی پر احمد فراز کہہ اُٹھے:

خونِ بے گناہاں کو جب بھی بیچ کر آئے
دوستوں کے شانوں پر زرنگار شالیں تھیں

فقیہہ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سُنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدّر کی

قاتل اِس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتّھر کی

وقت آیا تو میں مقتلِ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندگے تھے

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

رواں ہے قلزمِ خوں اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزل اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

احمد فرازؔ کے احساسات اور جذبات نہ کسی سرحد میں قید تھے اور نہ ہی کسی سرحد تک محدود تھے۔ احمد فرازؔ کے قلم سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ قید و بند سے آزاد نہ صرف اپنے شہر اور وطن بلکہ دنیا کے ملک و قوم کی نمائندگی کرتا ہے جو ظلم اور بربریت کا شکار ہو چکی ہے۔ انسان کی غلامی و محکومی مجبوری اور مایوسی دنیا کے ہر ملک اور قوم میں سرایت کر چکی ہے۔

نظم "اے مرے شہر!" میں احمد فرازؔ فرماتے ہیں

ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا

اے مرے شہر!
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم سہی
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے
فقط تو نہیں ہے

احمد فراز کے نزدیک تمام دنیا کے انسان ایک ہیں

کس سے ڈرتے ہو کہ سب لوگ تمہاری ہی طرح
ایک سے ہیں وہی آنکھیں وہی چہرے وہی دل
کس پہ شک کرتے ہو جتنے بھی مسافر ہیں یہاں
ایک ہی سب کا قبیلہ وہی پیکر وہی گِل

بیروت میں ظلم و بربریت، معصوم اور بے گناہوں کا خون وقتل وغاری دیکھ کر فرازؔ کے احساسات اور جذبات سے برانگیختہ ہو جاتے ہیں ان کے اندر کا شاعر بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ کہتے ہیں۔

بیروت۔ا

یہ سربریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ رِدا ہے کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں

جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں

یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغِ قاتلاں سے

کٹی ہوئی فصل کی طرح

جا بجا پڑے ہیں

یہ کون ماں ہے

جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے

بیروت ۔ ۲

میرے بچوں کے جسموں پر
زخموں کے پیراہن ہیں
ممتاؤں کی خالی گودیاں
بن کتبوں کے مدفن ہیں

جتنے بھی ساونت جواں تھے
پیہم کٹتے جاتے ہیں
میرے باغ کے جتنے پھول تھے
پل پل گھٹتے جاتے ہیں

ویت نام

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو

جس کا دامان و آستیں

خونِ بے گناہاں سے تر بتر ہے

تو نسلِ آدم

وفورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی

مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے

کہ کل کی تاریخ نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی

اے مہذب جہاں کی مخلوق

کل ترے رُو برو یہی بے ضمیر قاتل

ترے قبیلے کے بے گناہوں کو

جب تہہِ تیغ کر رہا تھا

تو تُو تماشائیوں کی صورت خموش و بے حس

درندگی کے مظاہرے میں شریک

کیوں دیکھتی رہی ہے

تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں

بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغِ برّاں میں

اور تری مصلحت کے تیروں میں

فرق کیا ہے؟

تو سوچتا ہوں

کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے

کس نے دُنیا کو بھی دَولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سَارے
کس نے دیوار تفاوت کی اُٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے سارے

دنیا میں امن وسلامتی، خیر و عافیت، حق وانصاف، اخوت و مساوات، آزادی انسان کی محافظ سلامتی کونسل کے کردار سے احمد فراز کا حساس دل بے خوف کہہ اُٹھا" ظلم "سلامتی کونسل کے چند بند ملاحظہ فرمائے۔

سلامتی کونسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غمخوار اُسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہ زناں " امن و مساوات کی خیر"
زر کی میزان میں رکھے ہُوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھُولوں میں چھپا رکھا ہے

امن کی فاختہ اُڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اسے
مرہمِ وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدۂ پُر خواں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمر کوریا ویت نام. دو منکن کانگو
کسی لبمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

احمد فرآز کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ صفت کے ساتھ ساتھ ان کے احساسات میں آفاقیت موجود ہے تمام دنیا کی ساری زمین ان کی تھی تمام دنیا کے انسان ان کے تھے۔احمد فرآز کا بے خوف قلم خود ان کی شخصیت کا ضامن ہے۔

نہیں کہ درد نے پتّھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس درد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب، میرے شعر ثبوت
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصُور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کا
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

احمد فراز

مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

احمد فرازؔ کی شاعری

شاعری انسان کا وہ احساس ہے، وہ اضطراب اور بے چینی ہے، وہ جذبہ اور جنون ہے، وہ موج طلاطم ہے اور وہ جوار بھاٹا ہے جو انسانی زندگی کی حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے۔ شاعری کے متعلق احمد فرازؔ فرماتے ہیں۔

''صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے۔''

احمد فرازؔ کے نزدیک شاعری صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ احساسات کا مجموعہ ہے جو شعر کی زبان بن کر احساس پر چھا جاتا ہے۔ احمد فرازؔ فرماتے ہیں۔

''یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ جب خلقِ خُدا ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہو اور لوگ اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے جانیں تک قربان کر رہے ہوں تو لکھنے والوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس تناظر میں ان کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک شعر میں احساس پیدا کرنے کی قوت نہ ہو تب تک وہ شعر نہ ہی پیغام بن سکتا ہے اور نہ ہی بیدار کر سکتا ہے۔ پیغام کا منصب ہی آگاہ کرنا، بیدار کرنا اور حق پہ قائم رہنا اور اگر شعر ان تمام خصوصیات سے خالی ہو تو وہ پیغام کے رتبے تک پہنچ نہیں سکتا۔

کہ شاعری بھی تو جزوِ پیمبری ہے فرازؔ
سو رنجِ خلقِ خدا صورتِ پیمبر کھینچ

ہونٹ سل جائیں مگر جرأتِ اظہار رہے
دل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو!

مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہوئی ہے پتھر کی

احمد فرازؔ فرماتے ہیں۔

''ہر دور میں مشاعرے کی افادیت رہی ہے کہ جب اظہار کے سبھی راستے مسدود ہو جائیں تو شاعری کے ذریعہ براہ راست ابلاغ کا در کھلا رکھا جاتا ہے۔''

احمد فرازؔ کی شاعری نے انسان میں وہ احساس پیدا کیا کہ ہر انسان اپنی جگہ اور اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ احساس مردہ دلوں میں زندگی کی توانائی پیدا کرتا ہے اور دنیا کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

''ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''
شیوہ ہے وہی گردشِ افلاکِ کہن کا

ترے نصیب اگر جا لگے کنارے سے
وگرنہ سیلِ زمانہ میں جو بہا سو بہا

پیغامِ مساوات کہ دُنیا کے لیے تھا
واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند

سادہ دل تماشائی پھر فریب کھا بیٹھے
بھیڑیوں کے جسموں پر ہرنیوں کی کھالیں تھیں

مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہیں لیکن
منعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند

یہ فتویٰ فروش و تہی آغوش و عبا پوش
پیران و فقیہانِ حرم اب بھی وہی ہیں

معنوں سے تہی کر کے ترے حرفِ خودی کو
شعروں سے فقط وعظ کی تزئین ہوئی ہے

آدھی رات بستی میں نقب زن جب آئے تھے
جھانجھریں تھیں پاؤں میں ہاتھ میں کدالیں تھیں

اِس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

معنویت، حقیقت، انفرادیت، فہم وادراک کی سادگی سے قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوگا۔ اور قاری کے ذہن میں اضطراری کیفیت پیدا کرے گا۔ احمد فرازؔ کی شاعری ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فرازؔ ہر خاص وعام کے ذہن کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سُرخ پتھر کی

شعلہ تھا جَل بُجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چُکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فرازؔ
کہ وہ اُٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

صیّاد و گل فروش ہی خوش بخت ہیں فرازؔ
جو بھی چمن پرست تھا زندانیوں میں تھا

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ برکو دیکھتے ہیں

اے زندگی اب اور کوئی تجربہ کہ ہم
تریاقِ عشق و زہرِ زمانہ چشیدہ ہیں

ریشۂ گل میں بھی ہے موجۂ خوں
خار کی نوک چبھوکر دیکھو

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فرازؔ
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں بُجھا نہیں کی

نشۂ لذتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

ایک تو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

شعر کی رومانیت، غمناکیت، جمالیت کے لئے ضروری ہے کہ شعر وجدانی قوت، خوش طبعی کو جلا بخشتے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ لطافت اور نفاست، نرمی و لطافت، اعتدال اور ہمواری، تناسب وتوازن، صوفی و عضوئی اثرات، بندش وچستی کا امتزاج، درد وکرب کی لذت ہی روحانی اور

عشقیہ شاعری کو جنم دیتی ہے۔ احمد فرآز کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا تمام عناصر احمد فرآز کی شاعری کے اہم عناصر ہیں۔ ان کے کلام میں باطن اور ظاہر کے درد و کرب، عشق و محبت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ہر ایک عشق کے بعد اور اس کے عشق کے بعد
فرآز اتنا بھی آساں نہ تھا سنبھل جانا

اب بجز ترکِ وفا کوئی خیال آتا نہیں
اب کوئی حیلہ نہیں شاید دلِ ناداں کے پاس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فرآز
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

تمام عمر اسی کے رہے یہ کیا کم ہے
بلا سے عشق حقیقی نہ تھا مجازی تھا

سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آ جاؤ
بڑا اُداس سماں ہے قریب آ جاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آ جاؤ

تیری باتیں ہی سُنانے آئے
دوست بھی دل ہی دُکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

نہیں تو اس کے تغافل کا کیا گلہ کرنا
جو حوصلہ ہے تو دامانِ یار بڑھ کر کھینچ

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں

شعلہ سا بدن زلف کی مخمل میں لپیٹے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

یاقوت سے لب سرو سا قدرات سی آنکھیں
وہ جانِ قیامت تھی مرے گھر مرے آگے

کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دُھواں
آرزوئے لب و رخسار میں یہ تو ہوگا

یہ دل جو تجھ کو بظاہر بھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے

غزل سُن کر پریشاں ہوگئے کیا
کسی کے دھیان میں تم کھو گئے کیا

ہم موحد ہیں بتوں کے پوجنے والے نہیں
پر خدا لگتی کہیں تو وہ صنم اپنی جگہ

یہ غزل دین اُس غزال کی ہے
جس میں ہم سے وفا زیادہ تھی

فرازؔ آج شکستہ پڑا ہوں بُت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیو داسی کا

اس عشق و ترکِ عشق میں ناصح کہاں سے آگیا
یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس

دیدہ و دل تو ترے ساتھ ہیں اے جانِ فرازؔ
اپنے ہمراہ مگر خواب نہ لے جا میرے

کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
وگرنہ زندگی ہم نے بھی کیا سے کیا نہیں کی

ہر اک سے کون محبت نباہ. سکتا ہے
سو ہم نے دوستی یاری تو کی، وفا نہیں کی

دیکھنا اے رہ نوردِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ رنگِ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے

خیالِ یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی
تو دھوپ پھیل گئی جا بجا اداسی کی

یہ شعلگی ہو بدن کی تو کیا کیا جائے
سو لازمی تھا ترے پیرہن کا جل جانا

اک شام ہے انتظار جیسی
اک یاد ہے یادِ یار جیسی

وہ بے خبر مری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طنز سے مرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

شعلہ سا بدن زلف کی مخمل میں لپیٹے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

شکایت اس کی نہیں ہے کہ اُس نے ظلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

وہ نادہند اگر تھا تو پھر تقاضا کیا
کہ دل تو لے گیا قیمت مگر ادا نہیں کی

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

یہ محفل تری، اہلِ محفل ترے
ہمارا تھا کیا ہم تو آ کر چلے

اب ترا دکھ نہیں رہا اتنا
جی محبت سے بھر گیا کچھ کچھ

یہ دیکھ تجھ سے وفا کی کہ بے وفائی کی
چلو میں اور کہیں مبتلاء رہا سو رہا

یہ بیگانہ روی پہلے نہیں تھی
کہو تم بھی کسی کے ہو گئے کیا

یہ دل جو تجھ کو بظاہر بھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کِس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

سب اپنے اپنے فسانے سناتے جاتے ہیں
نگاہِ یار مگر ہم نوا کِسی کی نہیں

سب اپنے اپنے خواب لئے اس کے در پہ تھے
میں بھی فرازؔ دیدۂ بے خواب لے گیا

زخم ہجراں کا بھر گیا کچھ کچھ
زہرِ غم کام کر گیا کچھ کچھ

عشق کے آخری مراحل میں
سچ کہوں میں بھی ڈر گیا کچھ کچھ

یوں دل سے کسی درد کا پیماں نہیں کرتے
اب جاں پہ بنی بھی ہے تو درماں نہیں کرتے

ہر یاد کو یوں زخم بناتے نہیں دل کا
ہر تیر کو پیوستِ رگِ جاں نہیں کرتے

جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے

دشتِ مجنوں نہ سہی تیشۂ فرہاد سہی
سفرِ عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں

چلو کہ کوچۂ دلدار چل کے دیکھتے ہیں
کسے کسے ہے یہ آزار چل کے دیکھتے ہیں

تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نوا گر، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے

احمد فرآز کی شاعری میں سچ اور حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ان کا ذہن مختلف عناصر اور ذائقوں کا ایک وسیع سمندر ہے جس میں سچ اور حقیقت کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ''سچ'' اور ''آرٹ'' یعنی ادب ایک طرح سے دونوں مختلف ہوتے ہیں۔ اور جہاں ''سچ'' ہو وہاں ''آرٹ'' یعنی ادب کم ہو جاتا ہے۔ مگر احمد فرآز کے کمال فن میں ''سچ'' اور ''آرٹ'' دونوں کو انتہائی خوبصورتی سے شیر وشکر کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فرآز کی شاعری غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے درد و کرب کو لئے ہوئے ہے۔

تو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحرِ مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

------------O------------

آج سے میرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اُتاروں گا تجھے

وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلّم ہے پکاروں گا تجھے

------------O------------

جنسِ ہنر کا کون خریدار ہے فرازؔ
ہیرا، کہ پتّھروں سے بھی سستا دکھائی دے

سنا ہے دیر و حرم میں تو وہ نہیں ملتا
سو اب کے اس کو سرِ دار چل کے دیکھتے ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا
تابہ کے آسرا خداؤں کا
ہاں فقط ایک نعرۂ وحشت
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا
یا تو یہ خیر و شر کے رکھوالے
موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے
چھین کر اپنی زندگی پا لے
موت کی بھیک مانگنے والے

وہ لکھو بس جو بھی امیرِ شہر کہے
جو کہتے ہیں دَرد کے مارے مَت لکھو

اس موسم میں گلدانوں کی رسم کہاں ہے
لوگو اب پھولوں کو آتشدان میں رکھنا

کل تاریخ یقیناً خود کو دُہرائے گی
آج کے اِک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عُمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رایئگاں نہ جائے گا

احمد فرازؔ کے نزدیک انسان کی آزادی اور انسانیت اہم مقام اور درجہ کے حامل ہیں۔انسان کا یہ حق ہے وہ آزادی کے ساتھ زندگی گذارے نہ کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے۔قوم وملک کی ترقی اور کامیابی کا انحصار آزادی پر ہے نہ کہ غلامی میں۔اور جب قوم اور ملک پر حاکمیت چھا جاتی ہے تو وہاں کا ہر انسان غلامی کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ جاتا ہے تو اُسے آزادی کی ایک سانس بھی میسر نہیں ہوتی۔حاکمیت انسان کو نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ باطنی طور سے اس طرح غلام بنا دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی آخری سانس تک اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔غلامی انسان کو مجبور اور محروم کر دیتی ہے۔اور احمد فرازؔ اس غلامی کے مجبور اور محروم انسان کو دیکھ نہیں سکتے اور فرماتے ہیں۔

''میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا جب میں خاموشی سے سب تماشا دیکھتا رہوں۔''

ڈھل چکی رات تو اب کہر بھی چھٹ جائے گی
اب بھی اُمید کی لو کم نہ کرو دیوانو!
آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک جس کے بعد
گلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک دامانو! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

آج اغیار کے تیروں سے بدن پر میرے
پھر وہی زخم چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
پھر اسی دشمنِ جاں دشمنِ دیں کے ہاتھوں
میرا ملبوس ہے گلرنگ بہاروں کی طرح
پھر مرے دیس کی مٹی سے لہو رِستا ہے
پھر در و بام ہوئے سینہ فگاروں کی طرح

ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فرازؔ
گُل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم

جو حرفِ جنوں تو نے سکھایا وہ کہوں گا
اے حق کی علامت، مجھے توفیقِ نوا دے

کہتے ہیں یہ دار و رسن کا موسم ہے
جو بھی جس کی گردن مارے مت لکھو

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اُس وقت سے لے کر آج تلک جلاّد پہ ہیبت طاری ہے

میرے دشمن، مرے قاتل نے ہمیشہ کی طرح
پھر سے چاہا کہ شکستہ مرا پندار کرے
جس طرح رات کا سفّاک شکاری چاہے
کہ وہ سُورج کی شعاعوں کو گرفتار کرے
یا چراغِ سرِ دیوار کو تنہا پا کر
جس طرح تند ہوا ٹوٹ کے یلغار کرے

چھیڑے کبھی میں نے لب و رخسار کے قصے
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نکھارا

گاہے کسی شہزادے کے افسانے سُنائے
گاہے کیا دنیائے پرستاں کا نظارا
میں کھویا رہا جن و ملائک کے جہاں میں
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پُکارا

دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کئی انقلاب اور کئی تحریکیں وجود میں آئیں اور جن کے اثرات انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر رونما ہوئے۔ادب انسانی زندگی کا ایک اہم جُز اور حصّہ ہے۔اور انسان کے ظاہر اور باطن میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔انقلابات اور تحریکیں ادب ہی کے ذریعہ انسان میں احساس اور شعور پیدا کرتی ہیں۔اور دنیا کے ایک خطہ کا انقلاب اور اس کی تحریکیں دنیا کے دوسرے خطے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ادب ہی کے ذریعہ انقلابات اور تحریکیں فروغ پاتی ہیں۔انسان جب تصوراتی زندگی سے سفر کرتا ہوا حقیقت کی زندگی سے آگاہ ہوا تو انسان کے احساس اور شعور میں ایک انقلاب رونما ہوا۔اور یہی انقلاب اور تحریک ادب میں ''ترقی پسند تحریک'' بن گئی۔اور حقیقت کے مشاہدے نے ایک نئے ذہن کو جنم دیا اور انسانی زندگی کی حقیقت کو واضح کردیا۔احمد فرازؔ کے مشاہدے نے خود ان کے باطن اور ظاہر میں وہ اثرات پیدا کئے جس کی وجہ سے احمد فرازؔ ایک احتجاجی، انقلابی، ظلم وستم کے خلاف ایک بے باک اور نڈر شاعر اور ادیب ہی نہیں بلکہ ایک ایسا انسان بن گیا جس میں دوسرے انسانوں کی محرومی، مظلومی، مجبوری، محکومی کا درد وکرب سما گیا اور ان کے قلم سے انسان کی محرومی کے آنسوں نکل پڑے۔

نظم ''سحر کے سُورج''

سحر کے سُورج

سحر کے سُورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہولہو ہے

وہ میرا مشرق

جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے

جو میرے اطراف کا نشاں

میری آبرو ہے

لہولہو ہے

سحر کے سورج

میں نصف تاریک

نصف روشن ہوں

کیا ہوا ہے

تجھے گہن لگ گیا

کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے

نظم ''قلم سرخرو ہے''

قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو
جو پتّھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب اُن کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

نظم ''سچ کا زہر''

سچ کا زہر
تجھے خبر بھی نہیں
کہ تیری اُداس ادھوری
محبتوں کی کہانیاں
جو بڑی کشادہ دلی سے
ہنس ہنس کے سُن رہا تھا
وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
باوفا و ثابت قدم
کہ جس کی جبیں پہ
ظالم رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کربناک شدّت سے
دل ہی دل میں
خموش، چُپ چاپ
مر گیا ہے

نظم ''شاخِ نہالِ غم''

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند

کب سے شاخِ نہالِ غم پر

لرز رہا ہوں

مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت

کہ جب بہاروں کی آخری شام

مُجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی

کہ جیسے اَب عمر بھر نہ دیکھے گا

ہم میں اک دوسرے کو کوئی

وہ رات کتنی کڑی تھی

جب آندھیوں کے شب خوں سے

بُوئے گُل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑ یُوں خشک و زرد رُو تھے

کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہوئے رفیقوں کی

نظم ''منصور''

منصور

وہ کیا خطا تھی؟

کہ جس کی پاداش میں ابھی تک

میں قرن ہا قرن سے شکارِ عبودیت

طوق در گلو۔۔۔۔پا بہ گل رہا ہوں

وہ جرم کیا تھا؟

کہ زندگی بھر تو میں

ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزارتا رہا ہوں

اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسۂ گدائی۔عذابِ عالم

تو کیا مری بے طلب ریاضت۔۔۔مجاہدت کا یہی صلہ ہے

مجھے گلہ ہے

نظم ''کہا نہیں تھا''

کہا نہیں تھا

کہا تھا

اُس شہر کو نہ جاؤ

اب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے

تو رو رہے ہو

کہ اب وہاں تم نہیں

نئے لوگ بس گئے ہیں

کہا تھا

اب شہرِ آرزو

دشتِ جاں رُبا ہے

گئے زمانوں کی خوشبوئیں کب سے مر چکی ہیں

جدائیاں کام کر چکی ہیں

تمہارے نغموں کے نرم پودے

نئی رُتوں کی شدید لو سے جھلس گئے ہیں

گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں کو

کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں

وہ گفتگوؤں کی آبجوئیں

سکوت کے ریگزار میں دفن ہو گئی ہیں

وہ عہد و پیماں کی فاختائیں

افق کے اُس پار کھو گئی ہیں

کہا تھا۔۔۔ وہ ساعتیں نہ لوٹیں گی

جو گئی ہیں

نظم ''خون فروش''

خون فروش

اے خدا ہسپتالوں میں بھی

اب مرے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے

کسی کو بھی میرے لہو کی ضرورت نہیں ہے

میں اپنے بدن میں

(کئی خون کی بوتلیں بیچ کر بھی)

ابھی تک لہو کے کٹورے لئے

صبحدم

اس توقع پہ گھر سے نکلتا ہوں

شاید۔۔۔۔

مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہوں

اُسی گھر میں

جس میں مرے خون کے لوتھڑے

جرعۂ شیر اور پارۂ نان کی آرزو میں

مرا راستہ دیکھتے ہیں

میں ہر روز

ہر وارڈ کو

ملتجی جسم سے دیکھتا ہوں

مگر ڈاکٹر مجھ سے کہتے ہیں

مردُود

اب تیرے خوناب میں

زندگی کی حرارت نہیں ہے

خُدایا

میں کیسے بتاؤں انہیں

خوں فروشی ضرورت ہے میری

تجارت نہیں ہے

شاعر، ادیب، افق کار اپنی زندگی اور اپنے دور کے مشاہدات، احساسات اور جذبات کا پیکر ہوتا ہے۔ احمد فرآز کے کلام کی خوبی اور خوبصورتی یہ ہے کہ اپنے مشاہدات، احساسات اور جذبات کو جرأت مندانا اور آزادانا طور پر اظہار کیا۔ ان کی طبیعت کی بے باکی اور نڈر پن مزاجی ادب اور شاعری میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ غمِ جاناں کے جذبات اور غمِ دوراں کے مشاہدات ان کے احساسات کو زندگی بخشی اور یہی زندگی ان کی نظم، غزل اور نثری نظم میں عیاں ہوتی ہے۔ اور یہ زندگی ہر ایک زندگی کا احساس اور اس کے شعور میں تحریک پیدا کر دی۔ اور یہ تحریک ہر دور اور ہر زمانے میں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فرآز کے کلام میں ایک ایسا انقلاب پوشیدہ ہے جس میں سادگی کے ساتھ ساتھ سچائی اور حقیقت موجود ہے۔ اور یہی سادگی اور سچائی ہر ایک کے دل میں احمد فرآز سے خلوص اور محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ احمد فرآز فرماتے ہیں۔

''مجھے اپنے بارے میں یا اپنی شاعری کے بارے میں نہ کوئی زعم ہے نہ دعویٰ ہے۔ ایک بات ضرور ہے میرے پڑھنے والوں نے مجھے ہمیشہ محبت دی۔''

احمد فرازؔ

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کا
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

احمد فرازؔ کے منظوم ڈرامے

ڈرامہ، افسانے اور ناول سے الگ جس میں کرداروں کے کردار آنکھوں کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ جس کے مکالمے کانوں کو سنائی دیتے ہیں۔ ابتدا ہی سے انسان اپنی زندگی کو فن کے ذریعہ پیش کیا چاہے وہ شاعری ہو یا وہ نثر ہو اس کے علاوہ بھی جو فن دنیا میں وجود میں آئے ہیں وہ انسان ہی کے ہیں اور انسانوں کی زندگی کے عکاسی کرتے ہیں۔ ڈرامہ بھی فن کا ایک حصہ ہے۔ ابتداء ہی سے انسان اپنی زندگی کی کردار اور مکالمے کی صورت میں اسٹیج پر پیش کرتا رہا۔

ڈرامے انسانی زندگی کے مختلف یعنی مذہبی، تاریخی، معاشی ومعاشرتی، سماجی وسیاسی، مجبوری و لاچاری، حاکمی اور محکومی، غریبی وامیری، اچھائی وبرائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے ہو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ڈرامہ کرداروں کے ذریعہ جب اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے تو لوگ گھروں سے نکل کر اسٹیج تک پہنچتے ہیں اور زندگی کو زندہ کرداروں سے دیکھتے ہیں۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ جب ریڈیو وجود میں آیا تو ڈرامے اسٹیج کے علاوہ ریڈیو تک پہنچے جہاں مکالمے ہی زندگی کے واقعات اور کرداروں کو لے کر گھر گھر پہنچے۔ نہ ہی اسٹیج کی ضرورت نہ ہی اسٹیج پر زندہ کرداروں کی حقیقت۔

آج کے دور میں T.V اور Internet نے وہ کردار نبھایا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کے ڈرامے زندہ کرداروں کے ساتھ ہر گھر پہنچ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ڈراموں کے لئے اسٹیج قائم ہے۔ لوگ آج بھی ڈرامے دیکھنے کے لئے ڈرامہ اسٹیج تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈرامہ آج بھی موجود ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔

احمد فرازؔ حقیقت پسندی کا ذہن لے کر پیدا ہوئے۔ ان کے سامنے ہر قسم کی زندگی موجود تھی۔ اپنوں نے زندگی کا وہ مشاہدہ کیا جس میں غریب، امیر، حاکم، محکوم، مجبور ولاچار، بھوک کی آگ، معصوم بچوں کی لاشیں جلتی ہوئی، تعصب ونفرت، مایوسی ومحرومی ہر وہ حقیقت تھی جس کی وجہ سے احمد

فرازؔ نے آواز بلند کی اور انسان کے احساس میں زندگی بیدار کی۔ اور انہوں نے اپنے منظوم ڈراموں کے ذریعہ بھی عوام کے ذہنی شعور کو بیدار کیا۔

راقم اعروف کے مطالعہ میں احمد فرازؔ کے جو منظوم ڈرامے رہے۔ ان میں

۱) سپاہی اور موت

۲) روشنیوں کا شہر

۳) موم کے پتھر

۴) آخرِ شب کے ہم سفر

۵) بودلک

۶) ساحل کی ریت

۷) شاعر اور گوریلا (منی ڈرامہ)

احمد فرازؔ کے منظوم ڈراموں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہر کردار زندگی کے احساس کے ساتھ اپنی نغمگی لئے ہوئے ہے۔ ہر ایک مکالمہ شعری حُسن کا ضامن نظر آتا ہے۔ اکثر ڈرامے نثر میں ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قاری اور سامع کو اکتاہٹ کی طرف لے جاتے ہیں۔ مگر احمد فرازؔ نے مکالموں میں نغمیت پیدا کر کے قاری اور سامع کے دل و دماغ پر اثر ڈالا ہے۔ اور ہر کوئی ان کرداروں میں کھو جاتا ہے۔ منظوم ڈرامہ نگاری بھی ایک مشکل فن ہے۔ مگر احمد فرازؔ کا قلم اس مشکل فن میں بھی اپنا اعلیٰ کردار نبھایا ہے۔

ہر ڈرامہ ہر تبصرہ ایک الگ کتاب کو جنم دیگا۔ قاری کے لئے ڈراموں کے چند مناظر پیش کر رہا ہوں۔ اور ان چند مناظر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ احمد فرازؔ نے منظوم ڈراموں کو کس خوبی اور خوبصورتی سے پیش کیا۔ ان کے ڈراموں کے تمام کردار ہمارے سامنے موجود تو نہیں ہوتے مگر ہم ان کرداروں کو دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور ہمارے دل میں احساس کی بیداری ہوتی ہے۔ چند مناظر دیکھئے۔

سپاہی اور موت

(ہوائی جہازوں کی بمباری ۔۔۔۔مورچے' لڑائی کا منظر۔۔۔۔

آہستہ آہستہ کیمرہ ایک پہاڑی کی طرف رُخ پھیر لیتا ہے جہاں برف سے ڈھکی چوٹی پر ایک زخمی سپاہی برف میں دبا پڑا ہے۔

سپاہی : کہاں ہوں

مرے جسم پر بوجھ کیسا ہے

کیا میں پہاڑوں کے نیچے دبا ہوں

مری سانس کیوں رُک رہی ہے

یہ ٹھنڈک رگ و پے میں کیوں ہے

مرے بازوؤں میں سکت ہے

نہ ہونٹوں میں جنبش کا یارا

نہ آنکھوں میں ہی روشنی ہے

چٹانوں کی صورت گرانبار پلکیں اُٹھانے سے عاری

تو کیا میری بینائی بھی جا چکی ہے؟

نہ چہرے' نہ منظر

نہ کوئی صدا ہے؟

یہ کیا ہے؟

مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی ہے

فقط دھند ہی دھند

اور برف کے بیکراں سائباں چار سُو ہیں

یہ سکرات کا پل ہے

یا مجھ پہ کابوس سایہ کناں ہے

۔۔۔۔۔یہ کیا ہے؟

میرے بازو میں کیوں درد کی لہر اُٹھی

میں زندہ ہوں

لیکن

بدن برف میں دفن ہے

اور چہرہ مرا

زمہریری ہواؤں سے سُند ہو چکا ہے

کسی کو خبر تک نہ ہوگی

کہ میں اِس پہاڑی کی چوٹی پہ زخموں سے چھلنی پڑا ہوں

کوئی مہرباں ہاتھ۔۔۔۔ہمدرد بازو نہیں ہے

جو اس کرّہ مرگ سے مجھ کو باہر نکالے

نہ جانے بہادر رفیقوں کے دستے کہاں ہیں

تو کیا میں یہاں

کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دوں گا

تو کیا اِس پہاڑی کی چوٹی پہ میرے تجسّس میں کوئی

نہ آئے گا

کوئی نہ آئے گا

کوئی ۔۔۔۔۔

موت : مگر میں سپاہی

فقط میں ۔ اجل ۔ موت

ازل سے ابد تک

تری غمگسار اور ساتھی

اکیلے دُکھی بے نواؤں کی واحد مسیحا

کہ جو زندگی کی جفاؤں سے تنگ آ چکے ہوں

کہ جو زندگی کی کڑی اور لمبی مسافت سے اُکتا چکے ہوں

کہ جو زندگی کے سرابوں سے،

پھیلے خرابوں سے گھبرا چکے ہوں

سبھی نامرادوں کو میں نے ہی آخر سہارا دیا ہے

جنہیں زندگی تج گئی ہو

انہیں صرف میں نے گوارا کیا ہے

ادھر آ ۔۔۔۔ مجھے ہاتھ دے

مین تری آخری چارہ گر ہوں

تری ہمسفر ہوں

تری راہبر ہوں (موت ہاتھ بڑھاتی ہے)

ادھر آ سپاہی ۔ مرے ساتھ چل

یہی وقت ہے

جبکہ تو اِک چراغِ سحر کی طرح

رہگزارِ عدم کا مسافر ہے

آ تجھ کو اپنی حفاظت میں

اِس برف کے تند طوفان سے لے چلوں میں

تجھے کیا خبر

کیسی قاتل ہواؤں کے جھکّڑ

ہمارے تعاقب میں ہیں

اے سپاہی مرے ساتھ چل

(ہواؤں کا شور)

سپاہی : کون ہے تو

اجل

فاحشہ!

تجھ کو کس نے پکارا کہ تو

بن بلائے یہاں آ گئی ہے

میں زندہ ہوں

میری نقاہت سے تُو نے یہ سمجھا

کہ میں زندگی سے مفر چاہتا ہوں

مری غیر ہموار سانسوں سے تو نے یہ جانا

کہ میں نزع میں ہوں

پرے ہٹ مرے جسم سے اپنی پرچھائی کو دور لے جا

موت : ترا جسم بے حس ہے
اور تیری آنکھوں پہ کہرا جما ہے
تجھے اس کا احساس بھی تو نہیں ہے
کہ تو صرف کہنے کو زندہ ہے
ورنہ اگر تو یہ دیکھے
کہ تیرا لہو کس قدر بہہ چکا ہے
اگر تو یہ دیکھے
کہ یہ لعل و یاقوت
جو تیرے پہلو میں بکھرے پڑے ہیں
ترے ہی لہو کی وہ بوندیں ہیں
جو برف پر جم گئی ہیں
تو جانے
کہ اب زندہ رہنے کی خواہش عبث ہے
چلو میں نے مانا
کہ تجھ میں ابھی زندگی کی رمق ہے
مگر کس قدر
صرف دو چار سانسوں کی مہلت
تری بے بسی اور نقاہت کا یہ حال ہے کہ
ترے زرد رخسار پر برف کی تہہ جمی ہے
مگر تجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں ہے

کہ چہرے سے اِس کو کھرچ دے

ترے سامنے جو اندھیرے ہیں ان سے نہ ڈر

بے خبر

رات بھی دن سے کچھ مختلف تو نہیں ہے

سپاہی : چلو میں نے مانا

مگر تو بتا مجھ سے کیا چاہتی ہے

موت : زیادہ نہیں

صرف اتنا کہ تو مان لے

زندگی اک مسلسل اذیت ہے

تو جس سے تنگ آ چکا ہے

سپاہی : تو۔۔۔

تو یوں کہہ کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت : کیوں نہیں

اور یہ الزام بھی خود پہ لینے کو راضی ہوں میں

سپاہی : دور ہٹ فاحشہ!

زندگی سے مجھے پیار ہے

موت : باؤلے!

اتنا پاگل نہ بن

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

اب ترے سامنے دوسرا راستہ ہی نہیں

اپنے ہاتھوں کی پیلاہٹیں دیکھ لے

اپنے ہونٹوں کی نیلاہٹیں دیکھ لے

اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹیں دیکھ لے

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

روشنیوں کا شہر

پہلا منظر

(گھڑیال سات بجاتا ہے اور پھر کسی آباد بازار کی مختلف
آوازیں فیڈ اِن ہوتی ہیں۔ اِن آوازوں میں محض کاروں کے
ہارن، گھنٹیاں، قہقہے اور بال رُوم کی موسیقی ہے۔)

بوڑھا : (کھانستے ہوئے، اپنے آپ سے)

اُف یہ جاڑے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے،۔۔۔جسم مفلوج ہوا جاتا ہے
جیسے شریانوں میں تھم جائے لہو کی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خزاں کا موسم
دونوں بے رنگ، حرارت سے تہی۔۔۔دونوں محرومِ تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنّم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو اک پیکرِ خاکستر ہوں
زندگی راکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدّتِ جاں تاب نہیں دے سکتی
اُف یہ جاڑے کی خنک شام
یہ ٹھنڈے جھونکے
(لہجہ بدل کر) خالدہ!

بند کر دے یہ دریچے سارے
کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی
میں چراغِ سحری اور تجھے
طلبِ بادِ شمال
کیا اسی دن کے لئے تجھ کو جواں ہونا تھا؟
(اپنے آپ سے)
کاش اِس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات!

آمنہ : (قدرِ دور سے ۔۔۔ سن رسیدہ آواز)
کیا ہوا؟ کیوں بلا وجہ پریشان ہوئے جاتے ہو؟
اِک ذرا صبر کرو
آگ روشن کیے دیتی ہوں ابھی
تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو
ایسے مطعون کرو

خالدہ بیٹیوں سے بڑھ کر مری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹتی گرتی ہوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہارا بھی بہت ہے ہم کو

جو شب و روز جوانی کے تقاضوں کو نچھاور کر کے

ہم پہ قربان ہوئی جاتی ہے

بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کمر بستہ ہے

بوڑھا : آمنہ، کتنی کم فہم ہے تُو

تیری کوتاہ نظر

صرف امروز کی مجرم ہے مگر

تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں

آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں

خالدہ کس لئے ہر شام کئی پہروں تک

اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم

اِس دریچے میں کھڑی رہتی ہے
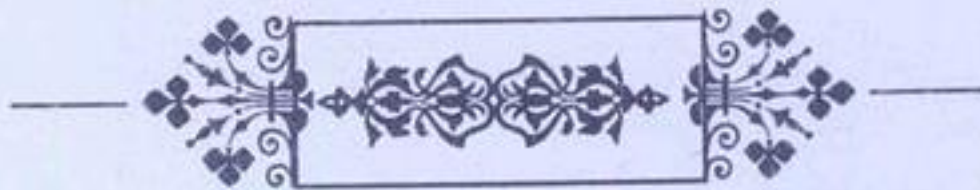
چوتھا منظر

(مصوّر کا کمرہ' چاروں طرف نامکمل تصویریں بکھری پڑی ہیں' جن پر گرد کی تہہ جم چکی ہے' مصوّر 'روشنیوں کے شہر' کی تصویر ایزل پر رکھے اس کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اب اِک تصویر میں تاریک مکان کی جگہ روشن مکان نے لے لی ہے۔)

مصوّر : تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

میرا دل میری تمنّا' مری جاں ہو جیسے

چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کردوں

زلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کردوں

حُسن کو پیرہنِ رنگ میں پنہاں کردوں

جھیل میں پرتوِ مہتاب رواں ہو جیسے

تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسونِ شباب

جس طرح شیشۂ مے سے نہ چھپے عکسِ شراب

آپ سے آپ کھلے جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب

آمدِ صبحِ بہاراں کا سماں ہو جیسے

تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

کس قدر سادہ و رنگیں ہے جوانی تیری

میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری

فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری

ہر مصوّر تری جانب نگراں ہو جیسے

تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ۔ کمرے کا دروازہ کھلتا ہے

اور مصوّر خاموش ہو جاتا ہے)

بوڑھا : (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ : (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر

تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور

دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ : نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے

میں کب تک یہ لاشیں اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں

مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے

مصوّر! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں ہے

کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہوئے شہر کی اِک کرن تھے

تمہارا وجود ایک زرتاب ذرّہ تھا جو

اپنے مرکز سے پھر جا ملا

تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے
جوان اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس
اک کرن ٔایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں
کہ جن کے لئے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں
تو کیا وہ مقدّس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر
میں اک لاش بن کر ٔاندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں
تو کیا یہ مری زندگی شپّرک کی طرح
تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی
مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہوا شہر ہے
روشنی کا سمندر ہے
جو سرد لاشوں سے بیگانہ ہنستی ہوئی زندگی کا جہاں ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت مری آرزوؤں کی قاتل
اُدھر روشنی۔۔۔۔زندگی
اور اِدھر۔۔۔۔موت ٔاور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر ٔموت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنالوں؟
میں اِس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اِس کشمکش کا مداوا ہے

میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت' شعاعوں بھرے شہر (دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)

بوڑھا : خالدہ! خالدہ!

(غمگین موسیقی)

آہ اے شہر' چمکتے ہوئے ہنستے ہوئے شہر

کتنا بے رحم ہے سفّاک ہے تو

تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلّاد

تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا' تیغِ ستم

تیرے نغموں کی کھنک' ساغرِ سم

تیری ضوبار عمارات ہیں' مقتل گاہیں

تیری رعنائیاں' آنکھوں کا فریب

یہ ترا حسن ملمّع ہے' نمائش ہے فقط

ریگِ رواں' موجِ سراب!

تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا

تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا

اے چمکتے ہوئے شہر

اے چمکتے ہوئے شہر

ساحل کی ریت

(سمندر کی لہروں کا خروش۔۔۔آبی پرندوں کی صدائیں
۔۔۔بعض ساحل نشینوں کی آوازیں اور قہقہے۔۔۔دُور سے
دھیمی آوازوں میں ملاحوں کا گیت سنائی دیتا ہے۔)

سلیماں : (خود کلامی کے انداز میں)

سمندر کی یہ نیلگوں وسعتیں کتنی سحر آفریں ہیں
ہواؤں کی نمناک خوشبو
تھکے ذہن کو کتنی آسودگی بخشتی ہے

سرِ شام
جب جھلملاتی ہے بھیگی ہوئی روشنی ساحلوں کی
تو کتنے ہی گلرنگ چہرے فضا تاب پیکر سنہرے بدن
چاند تاروں کی مانند اُترتے ہیں
اس تختۂ ریگ پر جس پہ میں بھی کھڑا ہوں
اداس اور تنہا
کوئی بھی تو ان میں نہیں ہے
جو آکر مرے خواب زاروں کے
خاموش و ویراں جزیروں کو دیکھے
جو تنہائیوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
بیس برسوں سے اب تک
زمانے کی آنکھوں سے اوجھل

کسی اجنبی چاپ کے منتظر ہیں
اگر کوئی آتا
تو بس۔۔۔۔میری تنہائیوں کے سمندر کو
ساحل سے ہی دیکھتا
اور پھر لوٹ جاتا
کسے کیا خبر
کون مجبورِ غم ان جزیروں میں محصور
خوابوں کی دنیا میں نوحہ کناں ہے
کہ میں ایک موج
اور منزل مری ہے حبابِ گریزاں
حبابِ گریزاں تلک کب کوئی موج پہنچی
مسافر کے ہمراہ منزل بھی گرمِ سفر ہے
(سمندری لہروں کا اثر)
مری زندگی تا بکے کُہر آلودہ خوابوں میں ڈوبی رہے گی
مجھے اب یقیں ہو چلا ہے
صداؤں کی شمعیں چمکتی رہیں گی
مگر میری خاموش و تاریک تنہائیوں میں اُجالا نہ ہوگا
اُجالا نہ ہوگا۔۔۔اُجالا نہ ہوگا
(لہروں کا صوتی اثر اور وحشیانہ قہقہہ)

ہمزاد : سُنا تو نے؟

یہ زندگی کی صدا ہے

جو طوفانِ ہستی میں بھی

کن اداؤں سے نغمہ سرا ہے

یہی تیرے دُکھ کی دوا ہے

سلیماں : نہیں میری محرومیوں کا کوئی بھی مداوا نہیں

اور میں

زندگی کا سفینہ شب و روز کھیتا رہا ہوں

فقط تند لہریں ہی میرا مقدر رہی ہیں

مگر اب مرے دست و بازو بہت تھک چکے ہیں

یہ معمول

دو چار دن کا

برس دو برس کا نہیں

بیس برسوں سے ہر شام

میں اس سمندر کی بیتابیاں دیکھتا ہوں

یہ موجیں مری آشنا ہیں

میں ان کے اشارے سمجھتا ہوں

جیسے یہ کہتی ہوں

آؤ۔۔۔یہیں ہے تمہارے حسیں خواب زاروں کا مدفن

یہاں ایسی گہرائیاں ہیں

کہ جن میں ہمالہ سے کہسار بھی ڈوب جائیں

کہ چشمِ خضر بھی نشاں تک نہ پائے

جہاں اتنی وسعت ہو

اتنی کشادہ دلی ہو

وہاں ایک کمزور انساں
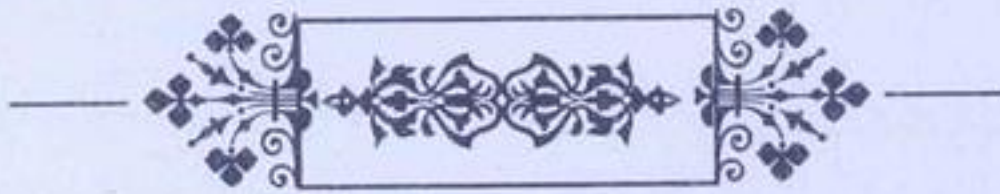
موم کے پتھر

فریدوں : یہ سچ ہے

کہ اب میں فقط سنگِ تربت ہوں

اپنی تمنا کا بے جان سایہ

مگر تم اسی شہر کو لوٹ جانے کو کہتے ہو بابا

جہاں سے مجھے

عالیہ۔۔۔۔اِس سکوں بخش بستی میں لائی تھی

تا کہ مرا فن

جو شہروں کی مسموم تہذیب

مصنوعی تابندگی

اور بیمار اقدار کے محبسوں میں

مقیّد تھا

آزاد ہو کر

نئی زندگی سے لہو لے

نئی زندگی، جو پہاڑوں کی صورت

توانا ہے

چشموں کی صورت رواں ہے

چناروں کی مانند

آتش بجاں ہے

اسے میرے فن سے، مری شاعری سے
پرستش کی حد تک محبت تھی۔۔۔بابا
اُسے میری ہر ایک تخلیق سے
والہانہ عقیدت تھی
وہ چاہتی تھی
کہ میرے قلم سے
وہ شہکار ٹپکیں
جو رہتے جہاں تک رہیں
تا ابد جاوداں
اُسے مجھ سے بڑھ کر مرے فن سے وابستگی تھی
مگر میں
جو الفاظ کے بتکدوں کا تھا آذر
فقط عالیہ کے تصوّر میں
اُس کے خدوخال میں
اُس کی قربت کی لذّت میں
گم ہو چکا تھا
خیالوں کے بیکل ہیولے
مری جنبشِ آزری کو ترستے ترستے ہی
دم توڑ دیے۔۔۔مگر مجھ کو اُن کی فنا کا قلق تک نہ ہوتا

آخرِ شب کے ہم سفر

رات کا سناٹا کہیں کہیں سے کسی چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے اور اُلّو کی آواز آجاتی ہے۔ موسیقی رات کی ہیبت اور ویرانی کا منظر پیدا کرتی ہے۔ وقفوں کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ کا تاثر یوں دیا جائے جیسے کوئی فوجی پہرہ دے رہا ہو۔ جب کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے قدموں کی چاپ ایک لحظہ کے لئے رُک جاتی ہے اور پھر جاری ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہتا ہے۔ پھر اچانک دُور سے ایک نوجوان عورت کی کربناک سسکیاں اور کراہیں سُنائی دینے لگی ہیں، فوجی بوٹوں کی چاپ رُک جاتی ہے۔ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ آندھی کی سیٹیاں سُنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آواز پھر اُبھرتی ہے۔ بہت دُور سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ اور نوجوان عورت کی کراہیں بین کے انداز میں سنائی دیتی ہیں۔ فوجی بوٹوں کی آواز رُک جاتی ہے۔

سپاہی : یہ آواز کیسی ہے

جیسے کوئی شدّتِ کرب سے رو رہا ہو

مگر اس سمے؟

نصف شب ہو چکی ہے

یہاں کون ہو گا؟

یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں

اور یہ چند لاشیں

کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں

کوئی زندہ پیکر

یہاں وادیٔ مرگ میں کیا کرے گا

یہ خطّہ تو کب سے ہے ویراں

یہاں کچھ شکستہ در و بام

اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں

مدّت سے یونہی کھڑے ہیں

(پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز)

نہیں یہ مرا واہمہ ہے

یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے

کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں

(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)

(دور سے رونے کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

نہیں واہمہ یہ نہیں

یقیناً کوئی رو رہا ہے

یہ آواز عورت کی ہے

جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا

سننے والے کے دل پر خراشیں لگائے

مگر اِس سمے اِس جگہ؟

کون ہوگا؟

یہ لاشیں مرے سامنے پتھروں کی طرح سرد و بے حس پڑی ہیں

یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی

اور ان کی حفاظت کو میں ہوں

فقط میں
کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے
تو پھر یہ صدا بین کی
یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے؟
کیسی ہے؟
کیوں ہے؟
یہاں تو بجز ایک معبد
کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے
تو جیسے اِسی میں کوئی ہے
عبادت کا یہ وقت؟

(سسکی)

لیکن نہیں
یہ تو رونے کی آواز ہے
اور وہ بھی کسی اپسرا کی
چلو جا کے دیکھوں
مگر شام تک تو
وہاں بھی
فقط چند بے نور شمعیں
شکستہ ظروف

اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی
آواز کوئی نہیں تھی
فقط خامشی اور اندھیرا
یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہوئی گھنٹیاں
بے صدا ہو چکی تھیں
تو پھر اس سمے کون ہے؟
سحر ہے
یا مرا واہمہ
کیا خبر
کوئی آسیب ہو
کوئی بدروح
جو اپنے پیکر کی فرقت میں
نالہ کناں ہو
مگر میں سپاہی ہوں
اِن واہموں سے مجھے کیا تعلق
میں بُزدل نہیں
خواہ کچھ بھی ہو
میں اس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا

(پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز)
(قدموں کی چاپ اور سسکیاں اُبھرتی ہیں)

عورت : قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں

یہی کہنے والے ہو تم

میرے شوہر کے قاتل

مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے

یہ تابوت جو میرے خوابوں کا مدفن ہے

میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے

اس کو مرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کر دے

کہ یہ ظلم احسان ہوگا

سپاہی : مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل

نہ میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابوت کس کا ہے

میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سن کر ادھر آ گیا تھا

عورت : اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہوگا

کہ قاتل تو سب ایک ہیں

ایک سے ہیں

مجھے اِس سے کیا

کس کے خنجر سے گھائل ہوئی ہوں

مجھے اس سے کیا

کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھونک ڈالا

وہ خنجر ترا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو

میں تو گھائل ہوئی

آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
مرا آشیاں تو جلا

سپاہی : ہاں یہ سچ ہے
مگر نیک خاتون
یہ زندگی کا وطیرہ رہا ہے
کبھی لطف کی ساعتیں
اور کبھی ظلم کے روز و شب
اس کے نخچیر سب ہیں
تجھے کیا خبر
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
ہر کوئی خود کو معصوم گردانتا ہے
یہاں تک کہ قاتل بھی
اور یہ حقیقت بھی ہے
آج میں تیری نظروں میں قاتل ہوں
کیونکہ
مرا جسم مقتول کے وار سے بچ گیا
ورنہ ہم ایک سی نیتیں لے کے
اِک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے
اگرچہ یہ دُکھ جاں گسل ہے
مگر حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں

بودلک

پہلا منظر

بودلک : قلش میرے ہمدم
کہو کوئی اچھی خبر لے کے آئے ہو
میں صبح سے مضطرب تھا
تمہیں کیا خبر
مجھ پہ یہ رات کتنی کڑی تھی
میں اک پل بھی سویا نہیں
اور پھر۔۔۔۔ نیند آتی تو کیسے
جب اک خوبصورت دلہن کی
جواں گرم سانسوں سے
میرا بدن
ایک چیتے کی مانند وحشی بنا تھا
تمہیں میری بے صبر آنکھوں نے نخلِ مقدس
کی جانب سے آتے
ہزاروں امیدوں سے دیکھا
یقیناً کوئی مژدۂ جانفزا لے کے آئے ہو
کیا تم نے نخلِ مقدس کے درویش دانا سے

میرے لئے بات کی۔۔۔؟

ژگولہ : تحمل!

کہ میں دردِزہ کی اذیت میں ہوں

اور وہ معصوم جاں

جو مری کوکھ سے باہر آنے کو بیکل ہے

اندر سے مجھ کو کترنے لگی ہے

۔۔۔میں عاصی ہوں۔۔۔اے مردِ درویش

لیکن۔۔۔یہ لغزش تو اس وقت مجھ سے ہوئی

جب مرے آدمی نے مرے جسم کی شعلگی پر توجہ نہ دی

ہاں جوانی کے تپتے ہوئے موسموں کے شب و روز میں

زندہ رہنے کی خاطر

مجھے دوسرے شخص کو خوشہ چینِ نہالِ تمنا بنانا پڑا

جو مری ہی طرح۔۔۔اپنے پیکر کے زنداں میں محبوس تھا

قلش : ہاں مرے ہاتفِ غیب

میں ہو گیا تھا

کہ جب پانیوں کے پہاڑ آج کے بدنما آسمانوں

کی صورت ہمارے سروں پر کھڑے تھے

تو میں بے مددگار و بے بس مکینوں کے ہمراہ تھا

اور اپنے مکاں ڈوبتے جا رہے تھے

ہزاروں مکاں

ان گنت لوگ اے پیرِ دانا
جو تعداد میں اس مقدس شجر کے حنا رنگ پتوں سے بھی
تھے زیادہ
یہاں تک کہ
اس تند طوفان کے آگے
ہمارے بزرگوں کی روحین بھی لاچار تھیں
اور مدد کو نہ آئیں
چنانچہ
ہزاروں کی تعداد میں ڈوبتوں کی صدائیں
پر آشوب موجیں بہالے گئیں
اور ہزاروں کی آہ و بکا تہہ نشیں ہوگئی
اور پھر اجنبی کشتیوں کا زبردست ملاح بھی جس کے
وردِ زباں حرفِ اول رہا تھا
اچانک ہی چپ ہوگیا
لیکن اب تک مرے کان میں وہ صدا گونجتی ہے

پیر دانا : قلش ۔۔۔۔تم جسے حرفِ اوّل سمجھتے رہے ہو
کسی اجنبی روح کا نام ہوگا

قلش : مقدس شجر کے مکیں!
حرفِ اوّل کی تفسیر اس کے عقیدے کی رو سے انوکھی تھی

پیر دانا : یعنی؟

قلش : وہ کہتا تھا

اس بزمِ ہستی کے نقشِ کہن سے بھی پہلے

فقط ایک ہی لفظ موجود تھا

اس کی برکت سے انسان پیدا ہوا

پھر اسی لفظ سے رفتہ رفتہ ہزاروں کی تعداد میں

آدمی بن گئے

پھر یہ تعداد بڑھتی گئی

اور یہاں تک

کہ ہم بھی اسی لفظ ہی سے بنے ہیں

بزرگ اور دانا۔۔۔۔مکین اور اعلیٰ

سبھی

اور یہ لہروں پہ بہتے ہوئے جھونپڑوں کے مکیں بھی

جنہیں ہم۔۔۔۔رسن در گلو کر کے قیدی بنا کے لئے جا رہے ہیں

شاعر اور گوریلا

ایمسٹر ڈیم میں تاریک الوطن حریت پسند نہایت محتاط اور خفیہ طور پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک گوریلا ایک شاعر ساتھی کا ہاتھ تپاک سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، مفارقت زدہ لوگ جنہیں سیاسی حالات نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ ایک اجنبی ملک میں دوبارہ یکجا ہوتے ہیں۔

پہلی آواز :

سوال یہ ہے کہ لوگ جو اپنی سرزمین کی آزادی کے لئے بندوق اٹھاتے ہیں۔ اور وہ جو پھولوں، محبت یا جنگ ہی سے متعلق نظمیں لکھتے ہیں کیا وہ ایک ہی خمیر رکھتے ہیں۔ یا وہ ساخت پرداخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دوسری آواز :

شاعر کا کام خواہ وہ جنگ کی حالت ہی کیوں نہ ہو قلمی کاوشوں تک محدود ہوتا ہے۔ ایسی جنگ جو شاعر کو نغمہ سازی پر نہ اکسائے ایک بے مقصد محاذ آرائی کے مترادف ہے۔

تیری آواز :

تمام انسان شاعر ہوتے ہیں
تمام شاعر انسان ہوتے ہیں

ادھر دور کہیں خون آلودہ جھاڑی میں دو حریت پرست زخموں سے چور زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں ان میں سے ایک جب بمشکل سانس لیتا ہے تو درد کی تپش اس کے وجود کو یوں جھلسا دیتی ہے جیسے نیپام اردگرد کے علاقے میں آگ بکھیر دیتا ہے۔ ایک ایسی آگ جسے فنا ہی بجھا

سکتی ہے۔اسی لئے وہ مرنا چاہتا ہے۔جتنی بھی جلدی ہو سکے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے اس جانکنی کے عذاب سے نہایت سست روی اور بے توقیری کے ساتھ گزرنا پڑے گا اس کے نوعمر ساتھی کو اپنے دوست کی جانکنی نہایت بے بسی سے دیکھنا پڑ ےگی۔

سنو خون اگلتے ہوئے منہ کی آواز

ساتھی :

مجھے ختم کردو۔ مجھے فوراً ختم کردو

(ادھر لندن کے ایک بلند بام فلیٹ میں ایک شاعر نے آخری الفاظ لکھ کر اپنی نظم کو تکمیل دے دی)

پہلی آواز :

یہ نہ بھولو کہ ہم جنگ لڑ رہے ہیں

دوسری آواز :

مگر ہم جنگ کیوں لڑ رہے ہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے۔

تیسری آواز :

اور یہ بھی نہ بھولو

ایک مرتبہ پھر دم توڑتا ہوا حریت پرست اپنے ساتھی سے رحم کی سزا کا تقاضا کرتا ہے۔

مجھے ختم کردو۔ساتھی مجھے دشمنوں کے لئے زندہ مت چھوڑو۔

پہلی آواز :

ہم ایمسٹرڈیم لندن اور نیویارک میں کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے قلم یہاں محض سیاہی رو ہیں جبکہ دوسروں کے جسم خون اگل رہے ہیں۔ وہ زندگیاں قربان کر رہے ہیں اور ہم گفتگوؤں میں

مصروف ہیں۔

یہاں محض الفاظ کی بوندا باندی

اور وہاں گولیوں کی مسلسل بارش

دوسری آواز :

لفظ کی برکتوں اور شعر کی تہذیب سے محروم جدوجہد سفاکیت کے مترادف ہوتی ہے۔

پہلی آواز :

جدوجہد کی پشت پناہی بغیر لفاظی محض ہوا ہے۔ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کی طرف سے جو قرض واجب ہے شاعر کو اس کی آگہی ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا سب شوروغوغا گھومتے ہوئے پنکھے کی بے معنی آواز کے سوا کچھ بھی نہیں۔

دوسری آواز :

شاعر اپنے فرض سے غافل نہیں وہ رفتہ اور آئندہ سے آگاہ ہے، لمحۂ موجود کا مطیع اور ساعتِ گزشتہ کا غلام ہوئے بغیر اپنی نغمہ گری جاری رکھتا ہے۔ اس گوریلا کے مصداق جو اپنے دشمن پر بندوق تان تو سکتا ہے لیکن اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ اس کی انگلی لبلبی پر ہے مگر لبلبی دبا نہیں سکتا۔ وہ اپنے حریف کو پہچان لیتا ہے جس کی بہن سے اس نے لڑکپن میں شدت سے محبت کی تھی ان موسموں میں جب خوبصورت اور لانبی دُم والے پرندے اپنی چونچوں کو پانیوں میں ڈبوتے ہیں۔

پہلی آواز :

ایسی شاعری کا کیا فائدہ

ایسے رحم کی کیا ضرورت

مختصر یہ کہ اصلی زبان بندوق اور پیغام فنا ہے

باقی سب بکواس ہیل کا موت

تیسری آواز :

شاعر اور لفظ

سپاہی اور بندوق

جدوجہد میں دونوں کو ہمقدم اور دوش بدوش ہونے کی ضرورت ہے۔

ائرکنڈیشنڈ کانفرنس ہال سے باہر ایمسٹرڈیم افریقہ کی طرح تپ رہا ہے۔ یہاں لوگ سورج مکھی کے پھولوں کی طرح جھلس رہے ہیں۔ لنڈن جاتے ہوئے دونوں اطراف پر لالے کے رنگا رنگ پھول قطار اندر قطار اپنی خوشبوؤں سے مست ورقصاں وین گاف کے نام پر اپنی عقیدتیں نچھاور کر رہے ہیں۔

(یہاں کسی بندوق چلنے کی آواز فضا میں نہیں تھرتھراتی)

ادھر دور خون سے لت پت کسی جھاڑی میں ایک زخمی حریت پرست دم توڑ چکا ہے۔ اس کی نزع اور فتح دونوں کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن آنے والے برسوں میں اس کے زندہ بھائیوں کے انتظار میں کون ہے؟

پہلی آواز :

جنگ میں شاعر کو اپنے خیالوں کی جانثاری کے ترانے گانے چاہیئے۔ بس گیت کی یہی مقصدیت ہونی چاہیے

دوسری آواز:

نہیں صرف ایسے گیت جو جنگ کا مقصد اور جواز بتائیں اُس کا موضوع ''جنگ کس کے لئے ہے'' ہونا چاہیئے

تیسری آواز :

جب ماؤ اور چے نے بندوق اٹھائی تب شاعر اور سپاہی نے لفظ اور گولی کو ہمزبان کر دیا۔

ایمسٹرڈیم میں سیاسی تارکین وطن جب ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو گوریلا، شاعر کا ہاتھ تپاک سے تھام لیتا ہے۔

افریقہ انتظار میں ہے
گولی اور حرف کے یکجان ہونے کا
گولی اور حرف کے ہمزبان ہونے کا
افریقہ انتظار میں ہے

ہالینڈ کا ایک خوبصورت مقام جو گل لالہ کے افراط کے لئے مشہور ہے۔

انتخابِ کلامِ احمد فراز

احمد فراز

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبانِ تیر کی ہے

اے مری ارضِ وطن!

اے مری ارضِ وطن ، پھر تری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے برسے ہوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اُجڑا ہوا موسم جیسے
سانس لیتے ہوئے اِس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اُٹھتا ہے ظالم جیسے

تو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحر مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

اور میں مستِ مئے رامش و رنگِ ہستی
اتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر
یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو ملا؟
جو لٹا دیتا ہے نشّے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مرے گھر کا چراغ
تیرے میخانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا ایاغ

میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چُوما
گرچہ جویائے محبت تھے ترے جسم کے داغ

حجلۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور تھا گر محوِ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنائی تھا
ایک پل آنکھ اُٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا

اوراب خواب سے چونکا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
ایک اِک حرف مرا تیر ملامت ہے مجھے
تُو اگر ہے تو مرا فن بھی مری ذات بھی ہے
ورنہ یہ شام طرب صبحِ قیامت ہے مجھے
میری آواز کے دُکھ سے مجھے پہچان ذرا
میں تو کہہ بھی نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

آج سے مرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اُتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلّم ہے پکاروں گا تجھے

رباعی

ہر غم کو دل آویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

دل گرمیٔ احساس سے پھُک جائیں گے
قدموں میں ترے زمانے جھک جائیں گے
اے حسن فقط جنبشِ ابرو کی ہے دیر
دنیا کے کاروبار رُک جائیں گے

O

تیرے چرچے ہیں جفا سے تیری
لوگ مر جائیں گے بلا سے تیری

کوئی نسبت کبھی اے جانِ سخن
کسی محرومِ نوا سے تیری

غمِ جاں ہو کہ غمِ دُنیا ہو
یاد دیتی ہے دلاسے تیری

اے مرے ابرِ گریزاں کب تک
راہ تکتے رہیں پیاسے تیری

تیرے مقتل بھی ہمی سے آباد
ہم بھی زندہ ہیں دعا سے تیری

تُو بھی نادم ہے زمانے سے فرازؔ
وہ بھی ناخوش ہیں وفا سے تیری

O

اِس کا سوچا بھی نہ تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری

آ گلے تجھ کو لگا لوں مرے پیارے دشمن
اِک مری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

میں تو صحرا کی تپش ، تشنہ لبی بھول گیا
جو مرے ہم نفسوں پر لبِ دریا گزری

آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

میری تنہا سفری میرا مقدر تھی فرازؔ
ورنہ اس شہرِ تمنا سے تو دنیا گزری

O

پھرے گا تو بھی یونہی کوبکو ہماری طرح
دریدہ دامن و آشفتہ مو ہماری طرح

کبھی تو سنگ سے پھوٹے گی آبجو غم کی
کبھی تو ٹوٹ کے روئے گا تو ہماری طرح

پلٹ کے تجھ کو بھی آنا ہے اس طرف لیکن
لُٹا کے قافلۂ رنگ و بو ہماری طرح

یہ کیا کہ اہلِ ہوس بھی سجائے پھرتے ہیں
دلوں پہ داغ جبیں پر لہو ہماری طرح

وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو ہُو بہُو ہماری طرح

ہمی فرازؔ سزاوارِ سنگ کیوں ٹھہرے
کہ اور بھی تو ہیں دیوانہ خُو ہماری طرح

کہا نہیں تھا

کہا تھا
اُس شہر کو نہ جاؤ
اب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے
تو رو رہے ہو
کہ اب وہاں تم نہیں
نئے لوگ بس گئے ہیں
کہا تھا
اب شہرِ آرزو
دشتِ جاں رُبا ہے
گئے زمانوں کی خوشبوئیں کب سے مر چکی ہیں
جدائیاں کام کر چکی ہیں
تمہارے نغموں کے نرم پودے
نئی رُتوں کی شدید لُو سے جھلس گئے ہیں
گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں کو
کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں
وہ گفتگوؤں کی آبجوئیں
سکوت کے ریگزار میں دفن ہو گئی ہیں
وہ عہد و پیماں کی فاختائیں
اُفق کے اُس پار کھو گئی ہیں

کہا تھا۔۔۔۔ وہ ساعتیں نہ لوٹیں گی
جو گئی ہیں
کہا تھا
تم قرب کے نشے میں
اَنا کے مینار چُن رہے ہو
کہا تھا
تم اس وفا کے صحرا میں
اپنی آواز سن رہے ہو
ڈراؤنے خواب بُن رہے ہو
تمہیں بڑا زعم تھا
کہ آنکھوں کے آئنوں سے
ہر انجمن کو سجا رہے تھے
تمہیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لُٹا رہے ہو
کہا تھا
ان آئنوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ
کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا
ان راستوں پر اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے محوِ رقص ہوں گے

یہ آئنے

جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں

تمہارے اشکوں کی کانچ ہے بس

یہ برف کے پیکروں کے شعلے

تمہارے سانسوں کی آنچ ہے بس

فراق کی بات ہی جُدا ہے

یہاں تو آنکھوں سے آئنوں سے

جو عکس اوجھل ہوا

تو پھر وہ کہیں نہیں تھا

پلٹ کے آئے تو کیا

نہ آئے تو کیا

کہ آنکھیں تو آئنے ہیں

اور آئنوں کو غرض نہیں ہے

کہ کون چہرہ نظر نشیں تھا

وہ کوئی پتھر تھا یا نگیں تھا

کہا نہیں تھا

O

میں تو ہر طرح کے اسبابِ ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں

وہ جو قاتل تھے وہ عیسا نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انہیں اہلِ عدالت دیکھوں

وہ جو بے ظرف تھے اب صاحبِ میخانہ ہوئے
اب بمشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں

گردنیں ٹوٹی ہوئی ، سَر ہیں خمیدہ جن کے
اُن کو سرگشتۂ پندارِ امامت دیکھوں

قیمتِ بے ہنراں نیلم و مرجاں ٹھہری
قسمتِ دیدہ وراں سنگِ ملامت دیکھوں

کذب کی ریگِ رواں یوں ہے کہ اُس کے آگے
خشک ہوتا ہوا دریائے صداقت دیکھوں

جانے کب دشنہ کو پیوستِ رگِ جاں کر دیں
ہر گھڑی میں جنہیں مصروفِ عبادت دیکھوں

O

اُس منظرِ سادہ میں کئی جال بندھے تھے
جب اُس کا گریبان کھُلا بال بندھے تھے

اے زُود فراموش کہاں تو ہے کہ تجھ سے
میرے تو شب و روز و مہ و سال بندھے تھے

وہ رشکِ غزالاں تھا مگر دام میں اس کے
ہم جیسے کئی صیدِ زبوں حال بندھے تھے

دیکھے کوئی ناصح کی جو حالت ہے کہ ہم تو
اس گیسوئے پیچاں میں بہر حال بندھے تھے

صیّاد کو پھر بھی مری پرواز کا ڈر تھا
میں گرچہ قفس میں تھا پر و بال بندھے تھے

یُوں دل تہ و بالا کبھی ہوتے نہیں دیکھے
اِک شخص کے پاؤں سے تو بھونچال بندھے تھے

وقت آیا تو میں مقتلِ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے

O

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ اُتار کے شہر کا
کوئی شخص تھا مرے شہر میں، کسی دُور پار کے شہر کا

چلو کوئی دل تو اُداس تھا چلو کوئی آنکھ تو نم رہی
چلو کوئی در تو کھلا رہا، شبِ انتظار کے شہر کا

کئی خوشبوئیں درِ دوست تک مرے ساتھ شمع بدست تھیں
مجھے پوچھنا نہ پڑا پتہ، مرے گُل عذار کے شہر کا

یہ جو میں نے تازہ غزل کہی سو ہے نذر اہلِ فراق کی
کہ نہ مل سکا کوئی نامہ بر مجھے میرے یار کے شہر کا

سو متاعِ جاں کو لئے ہوئے پلٹ آئے تیرے گرفتہ دل
کسے بیچتے کہ ملا نہیں کوئی اعتبار کے شہر کا

مری طرزِ نغمہ سرائی سے کوئی باغباں بھی تو خوش نہ تھا
یہ مرا مزاج ہے کیا کروں کہ میں ہوں بہار کے شہر کا

کسی اور دیس کی اور کو سنا ہے فرازؔ چلا گیا
سبھی دکھ سمیٹ کے شہر کے، سبھی قرض اتار کے شہر کا

بن باس

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو
میں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو اِک موسم غُربت کے دُکھ جھیل کے آیا
تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تھکی ہوئی اور ترسی ہوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اُترتے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کرلوں
اپنے چمن کے جلے ہوئے پودوں
اور گرد آلود درختوں کی
مُردہ شاخوں پر بین کروں
ہر مہجور ستون کو اتنا ٹوٹ کے چوموں
میرے لبوں کے خون سے
ان کے نقش و نگار سبھی جی اُٹھیں
گلی کے لوگوں کو اِتنا دیکھوں
اِتنا دیکھوں
میری آنکھیں
برسوں کی ترسی ہوئی آنکھیں
چہروں کے آنگن بن جائیں
پھر میں اپنا ساز اٹھاؤں
آنسوؤں اور مسکانوں سے جھلمل جھلمل
نظمیں غزلیں گیت سناؤں
اپنے پیاروں
درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں
لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر
اب باڑ ہے لوہے کے کانٹوں کی
شہ دروازے پر کچھ پہرہ دار کھڑے ہیں
جو مجھ سے اور مجھ جیسے دل والوں کی
پہچان سے عاری
میرے ساز سے
سنگینوں سے بات کریں
میں اُن سے کہتا ہوں
دیکھو
میں اس شہر کا نغمہ گر ہوں
برسوں بعد کڑی راہوں کی
ساری اذیت جھیل کے اب واپس آیا ہوں

اس مٹی کی خاطر

جس کی خوشبوئیں

دُنیا بھر کی دوشیزاؤں کے جسموں کی مہکوں سے

اور سارے جہاں کے

سبھی گلابوں سے

بڑھ کر ہیں

مجھ کو شہر میں

میرے شہر میں جانے دو

لیکن تنے ہوئے نیزوں نے

میرے جسم کو یوں برمایا

میرے ساز کو یوں ریزایا

میرا ہمکتا خون اور میرے سسکتے نغمے

شہ دروازے کی دہلیز سے

رِستے رِستے

شہر کے اندر جا پہنچے ہیں

اور میں اپنے جسم کا ملبہ

ساز کا لاشہ

اپنے شہر کے شہ دروازے

کی دہلیز پہ چھوڑ کے

پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پر

مجبورِ سفر ہوں

جن کو تج کر گھر آیا تھا

جن کو تج کر گھر آیا تھا

O

ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا جاتا
کاش منزل سے بھی آگے کوئی رستا جاتا

اے مرے ابرِ گریزاں مری آنکھوں کی طرح
گر برسنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

آج تک یاد ہے اظہارِ محبت کا وہ پل
کہ مری بات کی لکنت پہ وہ ہنستا جاتا

چلو پتھر نہ اُٹھاتے ترے دیوانے پہ لوگ
سرِ راہ کوئی آوازہ ہی کستا جاتا

اتنے محدود کرم سے تو تغافل بہتر
گر ترسنا ہی مجھے تھا تو ترستا جاتا

○

دل بدن کا شریکِ حال کہاں
ہجر کے ہجر ہے وصال کہاں

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

دل کہ خوش فہم تھا سو ہے ورنہ
تیرے ملنے کا احتمال کہاں

ایسا نشہ تو زہر میں بھی نہ تھا
اے غمِ دل تری مثال کہاں

وصل و ہجراں ہیں اور دنیائیں
ان زمانوں میں ماہ و سال کہاں

ہم کو بھی اپنی پائمالی کا
ہے مگر اس قدر ملال کہاں

تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراں ہیں
آگیا شہر میں غزال کہاں

میں نئی دوستی کے موڑ پہ تھا
آگیا ہے ترا خیال کہاں

تجھ پہ لکھی تو سج گئی ہے غزل
آ ملا خواب سے خیال کہاں

اب تو شہہ مات ہو رہی ہے فرازؔ
اب بچاؤ کی کوئی چال کہاں

پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریباں کئے ہوئے
جن وحشیوں پہ ہیں ترے احساں کئے ہوئے

تجدیدِ عشق کیا ہو کہ برسوں گزر گئے
تجھ سے کوئی سخن بھی مری جاں کئے ہوئے

اب تجھ سے کیا گلہ ہو کہ اک عمر ہوگئی
ہم کو بھی قصدِ کوچۂ جاناں کئے ہوئے

دل سے ہوئی ہے پھر ترے بارے میں گفتگو
تر آنسوؤں سے دیدہ و داماں کئے ہوئے

جی مانتا نہیں ہے کہ ہم بھی بھلا چکیں
تیری طرح سے وعدہ و پیماں کئے ہوئے

کچھ ضد میں ناصحوں کی تجھے چاہتے رہے
کچھ پاسداریٔ دلِ ناداں کئے ہوئے

ہم وہ کہ تجھ کو شعر میں تصویر کر دیا
صورت گرانِ شہر کو حیراں کئے ہوئے

بازار سرد تھا نہ خریدار کم نظر
ہم خود تھے اپنے آپ کو ارزاں کئے ہوئے

اے عشق ہم سے اور بھی ہوں گے زمانے میں
اچھے بھلے گھروں کو بیاباں کئے ہوئے

کچھ ہم سے نامراد کہ پھرتے ہیں کوبکو
دل کو کسی فقیر کا داماں کئے ہوئے

وعدہ کیا تھا اس نے کسی شام کا کبھی
ہم آج تک ہیں گھر میں چراغاں کئے ہوئے

اب اس کے جور سے بھی گئے ہم کہ جب سے ہیں
اپنے کئے پہ اس کو پشیماں کئے ہوئے

یہ رتجگے قبول کہ آرام سے تو ہیں
رکھتے تھے ورنہ خواب' پریشاں کئے ہوئے

ہم وہ اسیر ہیں کہ زمانے گزر گئے
"بند اپنے آپ پر درِ زنداں کئے ہوئے"

ترکِ وفا کے بعد ہوس اختیار کی
اس کاروبار میں بھی ہیں نقصاں کئے ہوئے

جانِ فراز مرگِ تمنا کے باوجود
بھولے نہیں ہمیں ترے احساں کئے ہوئے

ناموجود

اَے خُدا تری مخلوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہوچکی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی
اَب سفارتیں کیسی

بے وجود بستی میں
لوگ اب نہیں رہتے
سسکیاں سسکتی ہیں
سائے سرسراتے ہیں
سورجوں ، ستاروں کی
اَب بشارتیں کیسی

O

چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
"دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

وہ شوقِ بے پناہ میں الفاظ کی تلاش
اظہار کی زبان میں لکنت کے رات دن

وہ ابتدائے عشق وہ آغازِ شاعری
وہ دشتِ جاں میں پہلی مسافت کے رات دن

سودائے آذری میں ہوائے صنم گری
وہ بت پرستیوں میں عبادت کے رات دن

اک سادہ دل، دیارِ کرشمہ گراں میں گم
اک قریۂ طلسم میں حیرت کے رات دن

لب ہائے نارسیدہ کی لرزش سے جاں بلب
صہبائے ناچشیدہ کی لذت کے رات دن

روئے نگار و چشمِ غزالیں کے تذکرے
گیسوئے یار و حرف و حکایت کے رات دن

ناکردہ کاریوں پہ بھی بدنامیوں کا شور
اختر شماریوں پہ بھی تہمت کے رات دن

سوداگرانِ منبر و مکتب سے رو کشی
جاں دادگانِ دانش و حکمت کے رات دن

اہلِ قبا و اہلِ ریا سے گریز پا
وہ واعظانِ شہر سے وحشت کے رات دن

میرؔ و انیسؔ و غالبؔ و اقبالؔ سے الگ
راشدؔ، ندیمؔ، فیضؔ سے رغبت کے رات دن

فردوسیؔ و نظیریؔ و حافظؔ کے ساتھ ساتھ
بیدلؔ، غنیؔ، کلیمؔ سے بیعت کے رات دن

شیلےؔ کا سحر، کیٹسؔ کا دکھ، بائرنؔ کی دھج
ان کافرانِ عشق سے نسبت کے رات دن

تشکیک و ملحدانہ رویے کے باوجود
رومیؔ سے والہانہ عقیدت کے رات دن

جیسے مئے سخن سے صراحی بھری ہوئی
زورِ بیان و حسنِ طبیعت کے رات دن

یاروں سے شاعرانہ حوالے سے چشمکیں
غیروں سے عاشقانہ رقابت کے رات دن

اک رازدارِ خاص کو ہر وقت ڈھونڈنا
بے اعتباریوں میں ضرورت کے رات دن

شعری سفر میں بعض بزرگوں سے اختلاف
پیرانِ میکدہ سے بغاوت کے رات دن

وہ ہر کسی سے اپنا ہی احوال پوچھنا
اپنے سے بھی تجاہل و غفلت کے رات دن

رکھ کر کتابِ عقل کو نسیاں کے طاق پر
وہ عاشقی میں دل کی حکومت کے رات دن

بے وجہ اپنے آپ کو ہر وقت کوسنا
بے سود ہر کسی سے شکایت کے رات دن

ہر روز، روزِ ابر تھا ہر رات چاند رات
آزاد زندگی تھی، فراغت کے رات دن

رسوائیوں کی بات تھی رسوائیاں ہوئیں
رسوائیوں کی عمر میں شہرت کے رات دن

وہ صبح و شام در بدری، ہم سنوں کے ساتھ
آوارگی و سیر و سیاحت کے رات دن

اک دشمنِ وفا کو بھلانے کے واسطے
چارہ گروں کے پند و نصیحت کے رات دن

اِک محشرِ خیال کے ہجراں میں کاٹنا
تنہائی کے عذاب، قیامت کے رات دن

پہلے بھی جاں گُسل تھے مگر اس قدر نہ تھے
اک شہرِ بے اماں میں سکونت کے رات دن

اک لُعبتِ جمال کو ہر وقت سوچنا
اور سوچتے ہی رہنے کی عادت کے رات دن

اس دولتِ ہنر پہ بھی آزارِ مفلسی
اس روشنیٔ طبع پہ ظلمت کے رات دن

پھر یہ ہوا کہ شیوۂ دل ترک کر دیا
اور تج دیئے تھے ہم نے محبت کے رات دن

ہر آرزو نے جامۂ حسرت پہن لیا
پھر ہم تھے اور گوشۂ عزلت کے رات دن

ناداں ہیں وہ کہ جن کو ہے گم نامیوں کا رنج
ہم کو تو راس آئے نہ شہرت کے رات دن

فکرِ معاش ، شہر بدر کر گئی ہمیں
پھر ہم تھے اور قلم کی مشقت کے رات دن

''خونِ جگر و دیعتِ مژگانِ یار تھا''
اور مدّعی تھے صنعت و حرفت کے رات دن

کیا کیا ہمیں نہ عشق سے شرمندگی ہوئی
کیا کیا نہ ہم پہ گزرے ندامت کے رات دن

آکاس بیل پی گئی اک سرو کا لہو
آسیب کھا گیا کسی قامت کے رات دن

کاٹی ہے ایک عمر اسی روزگار میں
برسوں پہ تھے محیط ' اذیّت کے رات دن

ساماں کہاں کہ یار کو مہماں بلایئے
امکاں کہاں کہ دیکھیئے عشرت کے رات دن

پھرتے تھے میرؔ خوار کوئی چوچھتا نہ تھا
قسمت میں جب تلک تھے قناعت کے رات دن

سو یہ بھی ایک عہدِ زیاں تھا ' گزر گیا
کٹ ہی گئے ہیں جبرِ مشیت کے رات دن

نوواردانِ شہرِ تمنا کو کیا خبر
ہم ساکنانِ کوئے ملامت کے رات دن

کیوں نہ ہم عہدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
شاید اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں

نہیں ایسا بھی کہ اک عمر کی قُربت کے نشے
ایک دو روز کی رنجش سے ٹھکانے لگ جائیں

یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آنے لگ جائیں

ہم کہ ہیں لذتِ آزار کے مارے ہوئے لوگ
چارہ گر آئیں تو زخموں کو چھپانے لگ جائیں

ربط کے سینکڑوں حیلے ہیں، محبت نہ سہی
ہم ترے ساتھ کسی اور بہانے لگ جائیں

ساقیا! مسجد و مکتب تو نہیں میخانہ
دیکھنا، پھر بھی غلط لوگ نہ آنے لگ جائیں

قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں

اب فرازؔ آؤ چلیں اپنے قبیلے کی طرف
شاعری ترک کریں، بوجھ اٹھانے لگ جائیں

O

پھرا ہوں سارے زمانے میں در بدر کیسا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا مگر کیسا

وہ جانتا تھا کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں
پکارتا رہا اس کو اِدھر اُدھر کیسا

نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب ترا
فقط تکلفِ دیوار و در ہے ، گھر کیسا

میں جس کے ہجر میں رویا ہوں پاگلوں کی طرح
وہ کل ملا تو ہنسا میرے حال پر کیسا

عزیز تر تھی جسے نیند شامِ وصل میں بھی
وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسا

بس ایک شخص کی خاطر بس ایک دل کے لئے
وطن کو تج دیا دیوانگی میں ، گھر کیسا

کہاں کی دوستی ، کیسا فراق ، کون فرازؔ
میں خود کو بھول گیا تجھ کو بھول کر کیسا

ہواؤں کی بشارت

تمام ماؤں کے ہونٹ پتھر ہیں
اور آنکھوں میں زخم ہیں
اور دل تپکتے ہیں
رات کہتی ہے
''ان کے بیٹوں کو
شب گئے
چند لشکری
ساتھ لے گئے تھے
تو اب تلک اُن کی واپسی کی خبر نہیں ہے''
نہ واپسی کا گمان رکھنا
ہوائیں سہمے ہوئے چراغوں سے کہہ گئی تھیں
کہ آنے والی رُتوں کے آغاز تک
تمہارے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے
یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی
اور اُن کے آنسو جمے رہیں گے
اور اُن کی آہیں تھمی رہیں گی
نہ جی سکیں گی
نہ مر سکیں گی

نیا کشمیر

میری فردوس گل و لالہ و نسریں کی زمیں
تیرے پھولوں کی جوانی ترے باغوں کی بہار
تیرے چشموں کی روانی ترے نظاروں کا حسن
تیرے کہساروں کی عظمت ترے نغموں کی پھوار
کب سے ہیں شعلہ بداماں و جہنّم بکنار

تیرے سینے پہ محلّات کے ناسوروں نے
تیری شریانوں میں اک زہر سا بھر رکھا ہے
تیرا ماحول تو جنت سے حسیں تر ہے مگر
تجھ کو دوزخ سے سوا وقت نے کر رکھا ہے
تجھ کو غیروں نے سدا دست نگر رکھا ہے

مہ و انجم سے تراشے ہوئے تیرے باسی
ظلم و ادبار کے شعلوں سے جہاں سوختہ ہیں
قحط و افلاس کے گرداب میں غرقاب عوام
جن سے تقدیر کے ساحل بھی بر افروختہ ہیں
سالہا سال سے لب بستہ زباں دوختہ ہیں

اُن کی قسمت میں رہی محنت و دریوزہ گری
اور شاہی نے تری خلد کو تاراج کیا
تیرے بیٹوں کا لہو زینتِ ہر قصر بنا
تجھ پہ نمرود کی نسلوں نے سدا راج کیا

ان کا مسلک تھا کہ پامال کیا راج کیا

لیکن اب اے مری شاداب چناروں کی زمیں
انقلابات نئے دور ہیں لانے والے
حشر اُٹھانے کو ہیں اب ظلم کے ایوانوں میں
جن کو کہتا تھا جہاں بوجھ اُٹھانے والے

پھر تجھے ہیں گل و گلزار بنانے والے

O

شہرِ کتاب اُجڑ گیا، حرف برہنہ سر ہوئے
نغمہ ہے سُرمہ در گلو، شعر وطن بدر ہوئے

موسمِ درد کے صفیر جو بھی ندیم تھے، سو تھے
اب تو سبھی فریفتہ ، دانہ و دام پر ہوئے

جام وسبو کی آبرو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ ومحتسب ، شہر میں مُعتبر ہوئے

سرو جواں کی موت پر روئیں گی قُمریاں بہت
یوں تو بفیضِ باغباں قتل کئی شجر ہوئے

درخوارِ حرفِ یار تھے جن کے لئے ہمیں فرازؔ
آج وُہی ستم ظریف غیر کے نامہ بر ہوئے

قاتل

قاتل چُپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اُسے
گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے

لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل
اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر کب سُنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے
کس کو قتل کیا ہے؟

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اُس کو سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصّے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنہیں میری آرزو تھی مری طلب تھی
کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اُن میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا

مگر اُنہیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدل سے سُنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سُنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدس تریں صحیفے کی آیتیں تھیں

بانو کے نام

لے اوہ کم سن کنیز جسے بیگم جونا گڑھ نے قتل کروایا

ملوکیت کے محل کی گناہگار کنیز
وہ جُرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
ہر ایک جبر کو تُو سہہ گئی بطیبِ دلی

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی نے زروسیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اِس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اُونچے محلات کے بھرم کے لئے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انارکلی
کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بفیضِ وقت اگر کوئی راز کُھل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کجکلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

رباعی

یہ دَورِ مے، و جام چلے یا نہ چلے
نشّے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے
ہم اہلِ خرابات سے یوں بَیر نہ رکھ
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغِ دیر و کعبہ
پھر شمعِ خرابات جلے یا نہ جلے

O

ہم بھی مانگیں مراد ہو کچھ تو
جب رہا تیرے بعد ہو کچھ تو

کیسے پیماں کہاں کے قول و قرار
اُس ستمگر کو یاد ہو کچھ تو

کفر ہے، بے جواز مے پینا
تُو ہو یا ابر و باد، ہو کچھ تو

کیوں ابھی سے گلہ تغافل کا
ملنا جلنا زیاد ہو کچھ تو

آؤ رولیں فرازؔ دنیا کو
خوش دلِ نامراد ہو کچھ تو

O

دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں
وہ کسی خوابِ گریزاں میں ملا ہے سو کہاں

ہم نے مدت سے کوئی ہجو نہ واسوخت کہی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کہاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کہاں

آنکھ اسی طور برستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کہاں

بارہا کوچۂ جاناں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی دِلا ہے سو کہاں

جلوۂ دوست بھی دھندلا گیا آخر کو فرازؔ
ورنہ کہنے کو تو غم، دل کی جلا ہے سو کہاں

آگ میں پھول

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں مرے پاس نہ آ
اپنے دامن میں محبت کے حسیں پھول لیے
ان دلآویز بہاروں سے مجھے ربط نہیں

جب کوئی تازہ کلی نکہت و رنگت کی پلی
شبنمی حسن کے سیمین لبادے اوڑھے
مست پلکوں پہ لیے صبحِ جوانی کی پھوار
میرے تپتے ہوئے ماحول میں در آتی ہے
تو مرے سرد ارادوں سے دھواں اٹھتا ہے
میری آنکھوں میں الاؤ سے دہک جاتے ہیں
اور اس آتش و ظلمت کے گھنے لاوے میں
مسکراتی ہوئی شاداب کلی کی سانسیں

چند ہی لمحوں میں رک جاتی ہیں پھک جاتی ہیں
تو کہ تو بھی ہے کسی ذوقِ نمو سے سرشار
مست پلکوں پہ لیے صبحِ جوانی کی پھوار

ایک انجام سی منزل کو بڑھے آتی ہے
دیکھ اس شعلوں کی بستی کو ذرا غور سے دیکھ
ہر قدم پر جہاں انگارے ہی انگارے ہیں
تو یہاں رہ کے کبھی پھول نہیں بن سکتی
لوٹ جا پیشتر اس کے کہ ترے ہونٹوں میں
احمریں رس کی جگہ تند شرر گھل جائیں
ان مہکتے ہوئے رخساروں کے زرخیز کنول
آگ کے حلقۂ بے باک میں جھلسے جائیں

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں-----

O

نہ سب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
دامِ دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یارِ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروانِ رہِ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ ' پر یہ حقیقت ہے فراز
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

O

دل ٹھہرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں
ہم کہ تصویر بنے بس تجھے تکتے جاویں

چوبِ نم خوردہ کی مانند سلگتے رہے ہم
نہ تو بُجھ پائیں نہ بھڑکیں نہ دہکتے جاویں

تیری بستی میں ترا نام پتہ کیا پوچھا
لوگ حیران و پریشاں ہمیں تکتے جاویں

کیا کرے چارہ کوئی جب ترے اندوہ نصیب
منہ سے کچھ بھی نہ کہیں اور سسکتے جاویں

کوئی نشّے سے کوئی تشنہ لبی سے ساقی
تری محفل میں سبھی لوگ بہکتے جاویں

مژدۂ وصل سے کچھ ہم ہی زخود رفتہ نہیں
اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمکتے جاویں

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

ہم نوا سنجِ محبت ہیں ہر اک رُت میں فرازؔ
وہ قفس ہو کہ گلستاں ہو، چہکتے جاویں

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
کے نام

تم نے جس دن کے لئے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اک بوند نے طوفان اُٹھایا آخر
تم نے اک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے زلفِ ایام
حریت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ اُمید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

O

ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جاناں
کہ ہم نہ یاد کریں تجھ کو بھول کر جاناں

ہیں مثلِ نامۂ بے نام دستِ قاصد میں
سو ہم سے در بدروں کو وصول کر جاناں

پھر آ گئے ترے کوچے میں خوش نگاہ ترے
غمِ جہاں کی صلیبوں پہ جھول کر جاناں

کبھی تو دستِ حنائی سے سرخیٔ لب سے
ہمارے زخمِ تمنا کو پھول کر جاناں

یہ اہلِ درد تری مملکت میں رہتے ہیں
سو تُو خراج دلوں کے قبول کر جاناں

چلو وہ ترکِ تعلق کا فیصلہ ہی سہی
سو اختیار کوئی تو اصول کر جاناں

فرازؔ تجھ کو خداوند مانتا ہے' اسے
دیارِ عشق میں اپنا رسول کر جاناں

O

عاشقی بے دلی سے مشکل ہے
پھر محبت اُسی سے مشکل ہے

عشق آغاز ہی سے مشکل ہے
صبر کرنا ابھی سے مشکل ہے

ہم تن آساں ہیں اور ہمارے لئے
دشمنی، دوستی سے مشکل ہے

جس کو سب بے وفا سمجھتے ہوں
بے وفائی اسی سے مشکل ہے

ایک کو دوسرے سے سہل نہ جان
ہر کوئی، ہر کسی سے مشکل ہے

تو بضد ہے تو جا فرازؔ مگر
واپسی اُس گلی سے مشکل ہے

○

جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا
کوئی نامہ نہ ترے در بدروں تک پہنچا

مجھ کو مٹی کیا تو نے تو یہ احسان بھی کر
کہ مری خاک کو اب کوزہ گروں تک پہنچا

اے خدا! ساری مسافت تھی رفاقت کے لئے
مجھ کو منزل کی جگہ ہم سفروں تک پہنچا

تو مہ و مہر لئے ہے مگر اے دستِ کریم
کوئی جگنو بھی نہ تاریک گھروں تک پہنچا

دل بڑی چیز تھا بازارِ محبت میں کبھی
اب یہ سودا بھی مری جان' سروں تک پہنچا

وقت قاروں کو بھی محتاج بنا دیتا ہے
وہ شہِ حُسن بھی دریوزہ گروں تک پہنچا

اتنے ناصح ملے رستے میں کہ توبہ توبہ
بڑی مشکل سے میں شوریدہ سروں تک پہنچا

اہلِ دنیا نے تجھی کو نہیں لوٹا ہے فرازؔ
جو بھی تھا صاحبِ دل' مفت بروں تک پہنچا

O

دو گھونٹ کیا پیے کہ بدن میں لگی ہے آگ
ساقی! شراب ہے کہ سبو میں بھری ہے آگ

تقدیر ہنس رہی ہے کہ میں سوختہ نصیب
جنگل میں آگیا ہوں جو گھر میں لگی ہے آگ

جو ڈھونڈتے تھے آگ اُنہیں پیغمبری ملی
ہم کو پیمبری کی طلب تھی، ملی ہے آگ

اب باغ و باغباں سے کوئی کیا گلہ کرے
اب کے تو رنگِ گُل سے چمن میں لگی ہے آگ

جاناں ہم اہلِ درد کی تر چشمگی نہ دیکھ
داماں کو دور رکھ کہ دلوں میں چھپی ہے آگ

محفل کو کیا خبر جو ہمارے دلوں میں ہے
کب شمع ساں ہمارے سروں پر دھری ہے آگ

آتش بجاں ہیں کب سے محبت میں ہم فراز
اک بار جب لگی ہے تو پھر کب بجھی ہے آگ

احتساب

سوچ مفلوج ہے حالات کے زندانوں میں
عقل پر تلخ حوادث کے گراں تالے ہیں
آگہی سردو خموش
منجمد شعلۂ ہوش
ذہن پر بھولے فسانوں کے گھنے جالے ہیں
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے سیہ خانوں میں
قہقہے وقت کے خوش رنگ شبستانوں میں
کتنی دلدوز و غمیں آہوں کے رکھوالے، ہیں
آرزو جامِ طرب
آبرو زہر بلب
کتنے ہی ناگ خزانوں نے یہاں پالے ہیں
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں
زندگی رینگتی ہے موت کے ویرانوں میں
انقلابات نے انداز بدل ڈالے ہیں
رات دن شام و سحر
کس کو جرأت ہو مگر
ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں
آگ پھولوں نے بکھیری ہے گلستانوں میں

O

یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم

ہم سرِ چاکِ وفا ہیں اور ترا دستِ ہنر
جو بنا دے گا ہمیں اے یار، بن جائیں گے ہم

کیا خبر تھی اے نگارِ شعر، تیرے عشق میں
دلبرانِ شہر کے دلدار بن جائیں گے ہم

سخت جاں ہیں پر ہماری اُستواری پر نہ جا
ایسے ٹوٹیں گے ترا اقرار بن جائیں گے ہم

اور کچھ دن بیٹھنے دو کوئے جاناں میں ہمیں
رفتہ رفتہ سایۂ دیوار بن جائیں گے ہم

اس قدر آساں نہ ہوگی ہر کسی سے دوستی
آشنائی میں ترا معیار بن جائیں گے ہم

میرؔ و غالبؔ کیا کہ بن پائے نہیں فیضؔ و فراقؔ
زعم یہ تھا رومیؔ و عطارؔ بن جائیں گے ہم

دیکھنے میں شاخِ گل لگتے ہیں لیکن دیکھنا
دستِ گلچیں کے لئے تلوار بن جائیں گے ہم

ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فرازؔ
گُل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم

O

جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھنچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہِ گراں کھنچتا ہے

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کماں کھنچتا ہے

عہدِ فرصت میں کسی یارِ گزشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگِ جاں کھنچتا ہے

دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازۂ آئینہ گراں کھنچتا ہے

انتہاء عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون، کہاں، کھنچتا ہے

کھنچتے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرف قافلۂ عمرِ رواں کھنچتا ہے

ہم تو رہوارِ زبوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی مہمیز کرے خود ہی عناں کھنچتا ہے

رشتۂ تیغ و گلو اب بھی سلامت ہے فرازؔ
اب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھنچتا ہے

مسیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو
تو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دمساز ہیں
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں
تجھ کو میری مسرّت مقدّم سہی
تیرا غم مجھ کو وجہِ طرب تو نہیں

تیرا احسان ہے تُو نے میرے لیے
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُنے
خود کڑی دھوپ میں رہ کے میرے لیے
تُو نے زلفوں کے شاداب سائے بُنے
میری خاطر زمانے کو پاگل کہا
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تُو مری زندگی ہے مگر جانِ من!
اب وہ عشق و محبت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
ایک غم جس کی شدّت ہمہ گیر ہے
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

O

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر

وہ جو آسودۂ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے موج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسمِ ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش
پھرتا رہتا تھا جو گلیوں میں غبارے لے کر

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر

○

نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
ہم اپنے بے خبروں کو تلاش کرتے ہیں

محبتوں کا بھی موسم ہے جب گزر جائے
سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں

سنا ہے کل جنہیں دستارِ افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ عشق کیا ہے کہ اظہارِ آرزو کے لئے
حریف' نوحہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ ہم جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
در اصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

رہا ہوئے پہ عجب حال ہے اسیروں کا
کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں

فرازؔ داد کے قابل ہے جستجو ان کی
جو ہم سے دربدروں کو تلاش کرتے ہیں

منسوبہ سے

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تھ کو
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلّو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اُٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصوّر پہ تجھے تول دیا

جانشیں

(۱۹۵۲ء میں کراچی میں طلباء پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا
جاہلو!
تم اندھیروں کی دُنیا کے باسی
جہالت کے تاریک غاروں کے مُردے
کہاں جا رہے ہو کہاں؟
تم تہی دست ہو
تم تہی جیب ہو
تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں
تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم تمہارے لیے
کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو
منڈیوں میں سجائے ہوئے ہیں
تم نہیں دیکھتے
تم کہ شب کور ہو
ہم نے دن کے اُجالے میں بھی بس تمہارے لیے
اِس تمدّن کے فانوس روشن کیے
جن کی شفاف کرنوں سے سارا جہاں بقعۂ نور ہے
عالمِ طور ہے
پاگلو!
تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم ارسطو ہیں شاہوں کے اُستاد ہیں
ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گُر یاد ہیں
ہم ہی سقراط ہیں
ہم ہی بقراط ہیں
ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے خردمند فرزند ہیں
ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں
سر پھرو!
تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمہیں
خاک و خوں کے سمندر میں نہلا دیا

صرف اپنے تسلّط کی خاطر تمہیں
ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا
چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے

اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا
تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں
یہ تسلط یہ جاہ و حشم یہ زمیں
بس تمہارے لیے ہے تمہارے لیے
دورِ فردا کے فرمانروا ہو تمہیں
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشیں
پاگلو!۔۔۔۔۔ہم سے عالی نظر دیدہ ور
تم سے جو بھی کہیں مان لو
اپنے اپنے مراتب کو پہچان لو
تم نہیں جانتے تم کہ مردہ رہے سالہا سال سے
بھیڑیوں اور درندوں کی ارواحِ بد تم میں درآئی ہیں
اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو
بغاوت پہ اُکساتی ہیں
اپنے اجداد سے' اپنے فرمانرواؤں سے' آقاؤں سے
جاہلو!
پاگلو!!

O

جانے نشے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا
جیسے اک فتنۂ بیدار، رواں خواب میں تھا

وہ سرِ شام، سمندر کا کنارا، ترا ساتھ
اب تو لگتا ہے کہ جیسے یہ سماں خواب میں تھا

جیسے یادوں کا دریچہ کوئی وا رہ جائے
اک ستارہ مری جانب نگراں خواب میں تھا

جب کھلی آنکھ تو میں تھا مری تنہائی تھی
وہ جو تھا قافلۂ ہمسفراں خواب میں تھا

ایک شب ایک سرائے میں مکیں تھے دونوں
میں تو سویا ہی نہیں، وہ بھی کہاں خواب میں تھا

ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فرازؔ
شکر کر شکر کہ وہ دشمنِ جاں خواب میں تھا

O

جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوریٔ دل
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سفینے جنہیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
اُن کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فرازؔ
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

O

سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
وہ زخمۂ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن
فقط نمودِ سحر تک چراغ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالف تو زلف لہراؤ
کہ بادبان ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاسِ پیرِ مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ لبی
نشہ نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرازؔ
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

خون فروش

اے خدا ہسپتالوں میں بھی
اب مرے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے
کسی کو بھی میرے لہو کی ضرورت نہیں ہے

میں اپنے بدن میں
(کئی خون کی بوتلیں بیچ کر بھی)
ابھی تک لہو کے کٹورے لیے
صبحدم
اس توقع پہ گھر سے نکلتا ہوں
شاید۔۔۔
مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہوں
اُسی گھر میں
جس میں مرے خون کے لوتھڑے
جرعۂ شیر اور پارۂ نان کی آرزو میں
مرا راستہ دیکھتے ہیں

میں ہر روز
ہر وارڈ کو
ملتجی جسم سے دیکھتا ہوں
مگر ڈاکٹر مجھ سے کہتے ہیں
مرُدود
اب تیرے خوناب میں
زندگی کی حرارت نہیں ہے
خُدایا
میں کیسے بتاؤں انہیں
خوں فروشی ضرورت ہے میری
تجارت نہیں ہے

○

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو　　ریشۂ گل میں بھی ہے موجۂ خوں
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو　　خار کی نوک چبھو کر دیکھو

لذّتِ غم بھی عجب نشہ ہے　　اوس کی بُوند بھی ہے شیشہ نگر
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو　　آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

زندگی سلسلۂ خوابِ طرب　　ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
سایۂ زلف میں سو کر دیکھو　　خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت　　شب کے سنّاٹوں میں وہ بات کہاں
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو　　دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

کتنا دلکش ہے جہانِ گزراں　　تم بگولوں کے خداوند سہی
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو　　آتشِ گل تو فرو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی　　جو دیے لے کے نکلتے ہیں فرازؔ
اِن خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو　　وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھوکر دیکھو

O

کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

صرف اندیشۂ افعی ہی نہیں
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ درگور ہوئے اہلِ نظر
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

زیست وہ جنسِ گراں ہے کہ فرازؔ
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں

○

قاتل کے قصّے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے، کج کلہے، زرّیں کمرے
اُس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر میں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپ ہے فرازؔ
کتنی سیانی اِس پاگل کی باتیں ہیں

چند نادان چند دیوانے

رات کی جانگداز ظلمت میں
عزم کی مشعلیں جلائے ہوئے
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرار
وحشتوں کے مہیب سائے میں
سربکف، جاں بلب، نگاہ بہ قصر
سرخ و خونیں علم اٹھائے ہوئے
بڑھ رہے ہیں جنوں کے عالم میں
چند نادان چند دیوانے

قصرِ شاہی کے اے نگہبانو!
تلخ لمحوں سے ہوشیار رہو
اپنے پہروں پہ جم کے ڈٹ جاؤ
اپنے آقاؤں کی بقا کے لیے
فرض کے تند و تیز دھارے پر
تم وفادار ہو تو کٹ جاؤ

اس سے پہلے کہ مہرباں آقا
تند شعلوں کی زد میں آجائیں
اس سے پہلے کہ قصر جل اٹھے
خاک پر لوٹتے نظر آئیں
چند نادان' چند دیوانے

O

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزعمِ تمام
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نُور بجھنے لگا!
فرازؔ اُٹھو اب اُس کی گلی سے جائیں بھی

○

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے صبا
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تجھ سے ہم شکوہ کُناں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موجِ رواں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھا پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ مغاں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسّر تھی فرازؔ
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رَو
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

مشورہ

زیست کی تلخیوں سے گھبرا کر
اپنا دامانِ عجز پھیلا کر
آسماں کی طرف نگاہ کیے
اپنے ربِّ کریم کے در سے
موت کی بھیک مانگنے والے!
دیکھ اس زرنگار مسجد کو
آبِ زرّیں کی جھلملاہٹ سے
جس کے مینار جگمگاتے ہیں
تیرے ربِّ کریم کا گھر ہے
اور اس خانۂ مقدّس میں
مئے کوثر کے خم لنڈھائے ہوئے
شوخ غلماں لگائے سینے سے
ملک الموت نیم خوابیدہ
یادِ ربِّ کریم میں گم ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا
تابہ کے آسرا خداؤں کا
ہاں فقط ایک نعرۂ وحشت
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا
یا تو یہ خیر و شر کے رکھوالے
موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے
چھین کر اپنی زندگی پا لے
موت کی بھیک مانگنے والے

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تُو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازوسناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے جو
ظلم کے موسموں میں

کھُلے آسمانوں تلے

اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقّت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بُو ہے
قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو
جو پتھّر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں

وہی کوہکن

جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں

مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں

وہی جن کے جسموں کے پیوند

اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے

وہی سادہ دل

جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں

تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے

اب اُن کی ثنا چار سُو ہے

قلم سرخرو ہے

ویت نام

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کا دامان و آستیں
خونِ بے گناہاں سے تربتر ہے
تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذّب جہاں کی مخلوق
کل ترے رُوبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہِ تیغ کر رہا تھا
تو تُو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ برّاں میں
اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے

ایک منظر

دُور کچھ ماتمی نعروں سے فضا گونج اُٹھی
چند مجذوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
(کچھ سیہ پوش تماشائی بہ اندازِ جلوس)
چادرِ گُل سے سجائے ہوئے اعلام لیے!
دمبدم نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف
چیختا پیٹتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

یک بیک کھلنے لگے بند دریچوں کے کِواڑ
چلمنیں کانپتی باہوں کے سہارے اُٹھیں
جیسے دم توڑتے بیمار کی بوجھل پلکیں
اور کئی مضطر و بے تاب دمکتے چہرے
ایک دلچسپ و الم ناک تماشے کے لیے
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے
نُور کے چشموں کی مانند اُبل آئے ہیں

رباعی

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے
نشے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

ساغر میں ستارے گھل رہے ہوں جیسے
کرنوں کے دریچے کھُل رہے ہوں جیسے
مستی میں وہ اُٹھتی ہوئی نظریں توبہ
پلکوں پہ زمانے تُل رہے ہوں جیسے

○

کرتے بھی کیا جانا پڑا پھر سے اُسی قاتل کے پاس
ہم بارہا ہو آئے ہیں چارہ گرانِ دل کے پاس

کچھ بے گہر کی سیپیاں کچھ بے مسافر کشتیاں
دریا نے رخ بدلا تو کیا باقی رہا ساحل کے پاس

جن جن کو تھا زعمِ وفا، پندارِ جاں، دعوائے دل
محفل سجی تو جمع تھے سب صاحبِ محفل کے پاس

اس عشق و ترکِ عشق میں ناصح کہاں سے آ گیا
یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس

سعدیؔ و حافظؔ بھی سہی مسند نشینانِ غزل
لیکن کلیدِ میکدہ ہے غالبؔ و بیدلؔ کے پاس

کیا خضر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک راندۂ منزل کے پاس

رباعی

پھولوں کی جبیں جھلس گئی ہے یارو
گلزار میں آگ بس گئی ہے یارو
گزرے ہیں کہاں سے رنگ و بو کے طوفاں
شبنم کو فضا ترس گئی ہے یارو

اُڑتے پنچھی شکار کرنے والو
گلزار میں گیر و دار کرنے والو
کتنی کلیاں مَسل کے رکھ دیں تم نے
تزئینِ گل و بہار کرنے والو

O

غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا ہوا بُرا ہونا

خود نگوں سار، ہم سفر بیزار
اِک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانکاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشۂ لذّتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جائے فراؔز
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

○

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی تو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقّع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراقِ پریشاں جاناں

O

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھّر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

○

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب تختۂ ریگ ہے یہ چہرہ
دریا تھا سراب ہو چکا ہے

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

اب اور کوئی علاج غم کا
اب زہر شراب ہو چکا ہے

اُس رُت میں بھی بے نمو ہوں جس میں
کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

مت قتل کرو آوازوں کو

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اِس شہر میں نغمے بہنے دو جب قتل ہوا سُر سازوں کا
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو جب کال پڑا آوازوں کا

ہم پالنہار ہیں پھولوں کے جب شہر کھنڈر بن جائے گا
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں پھر کِس پر سنگ اُٹھاؤ گے
تُم کِس کا لہُو پینے آئے اپنے چہرے آئینوں میں
ہم پیار سکھانے والے ہیں جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

○

یوں تو پہلے بھی ہُوئے اُس سے کئی بار جُدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہُوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دُور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جُدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
''میں جُدا گریہ کناں، ابر جُدا، یار جُدا''

کجکلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرّۂ دستار جُدا

اِس قدر رُوپ ہیں یاروں کے، کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جُدا اور سرِ دربار جُدا

کُوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جُدا

O

جو بھی درونِ دل ہے وہ ماہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلّق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

جلّاد

تو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون
تو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے
ایسے بھی ہوتے ہونگے جن سے سُولی بھی شرماتی ہو
ایسے بھی جن سے دَار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمامہ ہے کوئی یا پرچم ہے سچائی کا
تو کیا جانے کس کے منارہٗ سر پہ کمند افگندہ ہے
وہ منصور کا حرفِ انا ہو یا عیسیٰ کی شمعِ دُعا
تجھ کو کیا نخچیر ترا کوئی مولا ہے یا بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے
سب کو خبر ہے بے گُنہی کا اکثر جو انجام ہُوا
میزانیں کن ہاتھوں میں تھیں جنبشِ ابرو کس کی تھی
کس پر اہلِ عدالت گرجے کس پر لُطف اکرام ہُوا

محفل محفل مقتل مقتل سب بسمل جلّاد ہے کون
کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے کوئی اشارہ جانے ہے
نام ہے کس کا دام ہے کس کا اور یہاں صیّاد ہے کون
"جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے"

O

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

○

ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہدِ وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترکِ محبت کرے، کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سن ہوگئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گل بن کے پھوٹتا ہے لہو شاخسار سے
زخمِ رگِ بہار ہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہوگیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

آگ

مفلسو! اپنے مقدّر سے شکایت نہ کرو
اس سے انسان کے ایمان میں فرق آتا ہے
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہو

کیا کہا؟ ''خانماں برباد ہوئے جاتے ہیں
دمبدم آگ کے بے رحم لپکتے شعلے
اپنے بوسیدہ مکاں راکھ کیے دیتے ہیں
خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی

مرمر و آہن و سیماں کی عماراتِ بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے''

ٹھیک کہتے ہیں مگر خام عقائد والو
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
اور پھر اپنی شکایت سے بھی کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے

O

سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہِ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجوم سرِ رہگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فرازؔ اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
''ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے''

O

سب لوگ لئے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نجانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قدو قامت نکل آئے

یہ کھیت یہ کھلیان

یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے
پُورے ہوئے اِک عمر کے ارمان ہمارے
ہم وہ جو کڑی دھوپ میں جسموں کو جلائیں
ہم وہ ہیں کہ صحراؤں کو گلزار بنائیں
ہم اپنا لہو خاک کے تودوں کو پلائیں
اس پر بھی گھروندے رہے ویران ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

ہم روشنی لائے تھے لہو اپنا جلا کر
ہم پھول اُگاتے تھے پسینے میں نہا کر
لے جاتا مگر اور کوئی فصل اُٹھا کر
رہتے تھے ہمیشہ تہی دامان ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

اب دیس کی دولت نہیں جاگیر کسی کی
اب ہاتھ کسی کے نہیں تقدیر کسی کی
پاؤں میں کسی کے نہیں زنجیر کسی کی
بھُولے گی نہ دنیا کبھی احسان ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

O

کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اُٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیس کی باتیں پرائے شہروں میں

کچھ اِس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ
تو چند اور چمن مسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہوئے تلخ تجربے پھر بھی
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فرازؔ ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر کر کے جنہیں لوگ لائے شہروں میں

O

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم ہوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشۂ دل میں
ایک دُنیائے بیکراں آباد

چند منظر اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جلا کر نہ رو محبت میں
یہ تو ہوتا ہے خانماں آباد

کتنے تارے فرازؔ ٹوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

O

قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ نہ دھڑکن نہ صدا

آخرِ عشق کی رُسوائی ہے
اب ہوا چرچا تو گھر گھر ہو گا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہو گا

وہم تھا قافلۂ ہم سفراں
مُڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

شبِ تیرہ ہی غنیمت تھی فرازؔ
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

○

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اِک دَور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

بے مہریٔ حیات کی شدّت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

اِک خواب ہو گئی ہے رہ و رسمِ دوستی
اِک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہو گی تمہیں فرازؔ
وہ محفلِ طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

O

گوارا بھی سہی جو دکھ ترے ہیں
مگر ہم کو کئی غم دوسرے ہیں

عجب اہلِ چمن کے دن پھرے ہیں
بہاروں کے بگولوں میں گھرے ہیں

وطن میں وضعداری نے نہ چھوڑا
پرائے شہر ہم در در پھرے ہیں

سمائے پھر نہ دنیا کی نظر میں
نہ جانے کس بلندی سے گرے ہیں

غنیمت ہے جو ہنس کر بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں

جو دنیا کے ہوئے وہ سخت روئے
خوشا وہ لوگ جو اب تک ترے ہیں

ابھی سے کیا حدیثِ قعرِ دریا
ابھی تو موجِ ساحل میں گھرے ہیں

فرازؔ آج اتفاقاً مل گئے تھے
یہ صاحب بھی تو دیوانے ترے ہیں

سلام اُس پر!

حسین!
اے میرے سر بریدہ
بدن دریدہ
سدا ترا نام برگزیدہ
میں کربلا کے لہولہو دشت میں تجھے
دشمنوں کے نرغے میں
تیغ در دست دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
کہ تیرے سارے رفیق
سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے

چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافرانِ رہِ وفا لُٹ لٹا چکے ہیں

اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارۂ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے
اِک داستاں کا حصّہ نہیں ہے
اِک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج اسی کربلا میں
بے آبرو نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی

حسین کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عزّ و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے
سلام اُس پر
سلام اُس پر

سحر کے سُورج

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہولہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشاں
میری آبرو ہے
لہولہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاعوں کا نُور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں
سحر کے سورج
ستم کی آندھی رُکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
سسک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں

جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں

کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج

مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں

جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے قدم جمائے

جو منتظر تھے

کہ رزم گاہِ طلب بلائے

جو آزمائش کی ہر گھڑی میں

یقین کی مشعلیں جلائے

وطن کی ناموس کے لئے

بے شمار بازو علم اُٹھائے

رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے

کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں

مگر وفا پر نہ حرف آئے

جو پابہ زنجیر

منفعل گردنیں جھکائے

عدو کے نرغے میں

ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

سحر کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں

سحر کے سورج

مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ

کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں

یہ تُو نہ دیکھے

یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چمچماتا لہو نہ دیکھے

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تُو نہ دیکھے

بیروت ۔ ا

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابُوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپُوت ہیں
جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں
یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغِ قاتلاں سے
کٹی ہوئی فصل کی طرح
جابجا پڑے ہیں
یہ کون ماں ہے
جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے
یہ کون بابا ہے
جس کی آواز شورِ محشر میں دب گئی ہے

یہ کون معصوم ہے
کہ جن کو
سیاہ آندھی دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کوئی جانتا نہیں
انہیں کوئی جاننا نہ چاہے
یہ کس قبیلے کے سربکف جاں نثار ہیں
جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے
کوئی بھی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحاں ہے
کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے
نہ کوئی بچہ نہ کوئی بابا نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چُپ
بادشاہ چُپ ہیں
حرم کے سب پاسبان
عالم پناہ چُپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لا الٰہ، چُپ ہیں

خوں بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہُوا
بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی راکھ میں لپٹی
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا

ایک منعم کی طرح
اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہوئے اوراق پر
لفظوں کے کچھ لعل و گہر
یاقوت و مرجاں۔۔۔رکھ دیے
لو خوں بہا
اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح
چپ ہو گیا

مت سوچو!

اور اس نے

مرے ساغر میں

مئے سرخ انڈیلی....... تو کہا

مت سوچو!

تم یہاں آئے ہو

اس ملک کے

اس شہر کے

اس حجلۂ تسکیں میں جہاں

سب کے سب رقص کناں

نغمہ بلب

مست ادا مت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا

مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو

پردیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افگار

عزیزانِ وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبّوں کو تو خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

آلائشیں جسموں کی ہیں

اس طرح سنبھالے ہُوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی مے کی طرح

شوخ ہے طرّار نہیں

زہراب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ شاملِ آداب نہیں

مت سوچو!

پیرس ۱۹۷۴ء

رباعی

ظلمات کو موجِ نور کیسے سمجھیں
پھر برق کو برقِ طور کیسے سمجھیں
مانا کہ یہی مصلحت اندیشی ہے
ہم لوگ مگر حضور کیسے سمجھیں

آشوب گہہِ دہر کے سوداگر ہیں
مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں
تم آبِ حیات مانگتے ہو ان سے
جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے تھے
وہ رُت چاک دامانی کی تھی
یا خون رونے کی
ہوائے مہرباں کی راہ تکنے کا زمانہ تھا
کہ فصلِ لالہ رُلعلیں کی حسرت میں
بدن انگار ہونے کا
سبھی موسم ہمیں پیارے رہے اس شہر کے
جو بد مقدّر تھا
کہ جس کی ساری دیواریں فصیلیں تھیں
کوئی روزن نہ رکھتی تھیں
وہ جس کی دُود کش پہنائیاں
آنکھیں جلاتی تھیں
مگر روشن نہ رکھتی تھیں
ڈری سہمی ہُوئی خلقت کی لاشیں
اس لئے گلیوں میں پھرتی تھیں
کہ وہ مدفن نہ رکھتی تھیں
مگر پھر بھی ہمیں اِس شہر سے
کتنی محبت تھی
محبت ہے
کہ یہ شہرِ سحر نا آشنا
جس کا مقدّر رات تھی یا صبحِ کاذب تھی
گلی کُوچوں میں
بازاروں میں
دہلیزوں پہ بیٹھے منتظر لوگو
تمہیں بھی صبحِ صادق کا تصور
خواب پیارا تھا
ہمیں بھی تھا
چلو تاروں کا قتلِ عام بھی ہم کو توارا تھا
ہمیں بھی اور تمہیں بھی
جن سیہ راتوں نے مارا تھا
یہی سُنتے رہے ہم تُم
انہیں کے دامنوں میں صبحِ صادق جاستارا تھا
مگر اس مرتبہ
جس جھٹپٹے کو
روشنی کا اوّلیں زینہ سمجھ بیٹھے
اُسی کی آخری منزل پہ

اب سُورج کی نیلی لاش رکھی ہے
(کسی آسیب نے شب خون مارا تھا)
مگر اب سب کے چہرے اس قدر فق
اور بازو اس قدر شل ہیں
کہ جیسے کور چشماں گورکن
مصلوب سُورج کی بجائے
شہر کو دفنا کے آئے ہیں
چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے رہے
اور ہم جسے خود اپنے ہاتھوں سے
کفن پہنا کے آئے ہیں
جسے دفنا کے آئے ہیں

○

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ

یہ حرف و لفظ ہیں دُنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

خیال ان کا بھی آیا کبھی تجھے جاناں
جو تجھ سے دُور بہت دُور جی رہے تھے الگ

ہمی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو دُنیا سے سوچتے تھے الگ

اکیلے پن کی اذیت کا اب گلہ کیسا
فرازؔ خود ہی تو اوروں سے ہو گئے تھے الگ

O

دشتِ نامرادی میں ساتھ کون تھا کِس کے
مرثیے سناتی ہے شہر کی ہوا کِس کے

ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سُناتا ہے یارِ بے وفا کِس کے

عہدِ ہجر میں یارو سَب کے حوصلے معلُوم
دِل پہ ہاتھ تھا کس کا لب پہ تھی دُعا کِس کے

کل صلیب گر جو تھا کل صلیب پر جو تھا
آج نام لیوا ہیں لوگ جابجا کِس کے

اَب فرازؔ تجھ پر بھی اعتبار کیا کیجئے
انتظار تھا کس کا ساتھ چل پڑا کِس کے

رباعی

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے ہٹ جاؤ

ہر زخم کو سینے پہ سجا لیتے ہیں
ہر درد کو ہم دل میں بسا لیتے ہیں
تم پھولوں پہ سوتے ہو تو دکھتا ہے بدن
ہم کانٹوں کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

O

چراغِ شامِ وَفا میں جلے نہ تھے ایسے
کہ دِل زدوں میں کبھی من چلے نہ تھے ایسے

ہجوم ایسا کہ مقتل میں جا نہیں ملتی
یہ جاں نثار سروں سے ٹلے نہ تھے ایسے

جو اہلِ دل تھے وہ جاں سے گزر گئے کہ نہیں
فرازِ یار ترے مرحلے نہ تھے ایسے

جہاں کی وضع کو دیکھو تو ہم سے پیار کرو
چلو یہ مان لیا ہم بھلے نہ تھے ایسے

فرازؔ اَب کے عجب آگ سی وجود میں ہے
کہ دل میں زخم تو تھے آبلے نہ تھے ایسے

O

خود کو ترے معیار سے گھٹ کر نہیں دیکھا
جو چھوڑ گیا اس کو پلٹ کر نہیں دیکھا

میری طرح تُو نے شبِ ہجراں نہیں کاٹی
میری طرح اس تیغ پہ کٹ کر نہیں دیکھا

تو دشنۂ نفرت ہی کو لہراتا رہا ہے
تو نے کبھی دُشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا

تھے کوچۂ جاناں سے پَرے بھی کئی منظر
دِل نے کبھی اس راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

اب یاد نہیں مجھ کو فرازؔ اپنا بھی پیکر
جِس روز سے بکھرا ہوں سمٹ کر نہیں دیکھا

○

ہر کوئی تیری داستاں انجمن انجمن کہے
اَب کے ترے فراق میں ہم نے عجب سخن کہے

دونوں کو زعمِ عشق ہے، لیکن اس اختلاف سے
میں اُسے جسم و جاں کہوں تو اُسے پیرہن کہے

وقت پہ اپنے آپ کو سَب سے گلے لگا لیا
یُوں تو نگارِ شہر کو ہر کوئی جانِ مَن کہے

ضبط کے موسموں میں بھی دونوں شریکِ حال تھے
فصلِ سپردگی ہے اب کچھ تو ترا بدن کہے

خلعتِ شہر یار کو سب نے قبول کر لیا
میں بھی اُسے کفن کہوں تو بھی اسے کفن کہے

گفتۂ یار پر فرازؔ کس طرح حرف گیر ہُوں
ہم نے بھی اُس سے بارہا جھوٹ ضرورتاً کہے

حروف کی شہادت

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پورے اُتر چکے
اب قرض چکائیں
اس کی کھڑاؤں وہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی
چادر کا حقدار وہی ہے
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی
آؤ اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بتلائیں
مُردوں کو زندہ کرنے کا
معجزہ بھی دکھلائیں
لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟

O

نہ جانے ایسی بھی کیا بات تھی سخن میں مرے
ہزار تیر ترازو رہے بدن میں مرے

یہ کیسا درد کا سیلاب جی سے گزرا ہے
یہ کس نے آگ لگادی ہے پیرہن میں مرے

ترے وصال کے نشّے ترے فراق کے دُکھ
تمام ذائقے محفوظ ہیں بدن میں مرے

دلِ فریب زدہ پھر نئے فریب میں ہے
کہ تذکرے ہیں بہت تیری انجمن میں مرے

نہیں کہ زیست ہی اپنی قبائے مفلس تھی
فرازؔ سینکڑوں پیوند ہیں کفن میں مرے

O

اے تو کہ روز و شب کو مہ و آفتاب دے
برسوں کی جاگتی ہُوئی آنکھوں کو خواب دے

میں وہ کہ نقش گر ترے ارض و سما کا ہُوں
تو وہ کہ مجھ کو دونوں جہاں کے عذاب دے

میں نے تو تن بدن کا لہُو نذر کر دیا
اے شہر یار تُو بھی تو اپنا حساب دے

وہ سنگ ہو کہ پھُول، ودیعت ہے یار کی
لازم نہیں گلاب کے بدلے گلاب دے

اہلِ ہنر کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے
اَب کون پتھروں کو نگینوں کی آب دے

اب جو بھی حال کوئے ستمگر میں ہو فرازؔ
اب جو بھی بد دعا دلِ خانہ خراب دے

O

یُوں تو کہنے کو بہت لوگ شناسا میرے
کہاں لے جاؤں تجھے اے دلِ تنہا میرے

وہی محدود سا حلقہ ہے شناسائی کا
یہی احباب مرے ہیں یہی اعدا میرے

میں تہہِ کاسہ و لب تشنہ رہوں گا کب تک
تیرے ہوتے ہوئے اے صاحبِ دریا میرے

مجھ کو اس ابرِ بہاری سے ہے کب کی نسبت
پر مقدّر میں وہی پیاس ہے صحرا میرے

دیدہ و دِل تو ترے ساتھ ہیں اے جانِ فرازؔ
اپنے ہمراہ مگر خواب نہ لے جا میرے

○

اب کس کا جشن مناتے ہو!
اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہُوا
اب کس کا گیت سُناتے ہو
اُس تن من کا جو دو نیم ہُوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
اِن آنکھوں کی تقدیر ہُوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہُوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہُوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہُوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بدقسمت تھا
راہوں میں بہایا تن میں رہا
اُس پھُول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کِھلا یا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسےٰ کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

اُن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہُوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھُوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہُوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دُکھ کا نشانہ ہُوئے

اُس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصّے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھّا ہے اِس قصّے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لئے
اُس جشن میں شامل ہوں میں بھی
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

○

میں چُپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف

میں مر گیا وہیں کہ صفِ قاتلاں سے جب
خنجر بدست تو بھی رواں تھا مری طرف

اب پھر رہا ہوں جسم کے ٹکڑے لیے ہوئے
شاید ہجومِ چارہ گراں تھا مری طرف

مجھ کو مری شکست کا کوئی جواز دو!
کہتے ہیں روشنی کا نشاں تھا مری طرف

یہ اور بات تو نے زمانے کی بات کی
زوئے سخن تو اے مری جاں تھا مری طرف

میں لشکرِ الم کے مقابل ہوں سرخرو
اس معرکے میں دل سا جواں تھا مری طرف

میں نے ستم گروں کو پکارا ہے خود فرازؔ
ورنہ کِسی کا دھیان کہاں تھا مری طرف

جو غیر تھے وہ اسی بات پر ہمارے ہوئے

کہ ہم سے دوست بہت بے خبر ہمارے ہوئے

کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی

بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے

اب اِک ہجومِ شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے

جنہیں کوئی نہ مِلا ہم سفر ہمارے ہوئے

کِسی نے غم تو کِسی نے مزاجِ غم بخشا

سب اپنی اپنی جگہ چارہ گر ہمارے ہوئے

بُجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو

اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہوئے

وہ اعتماد کہاں سے فرازؔ لائیں گے

کِسی کو چھوڑ کے وہ اَب اگر ہمارے ہوئے

میرے عصر کے مُوسیٰ

مالک
میں لفظوں کا گڈریا
حرفوں کے بُزغالے
میری دُنیا ہے
اس دُنیا اور اس کے دکھوں کے
بھونچالوں سے
جب بھی مجھے پل دو پل ملتے
اور تجھے
سارے افلاک
اور ساری زمینوں
کے سارے بسنے والوں کے
سارے جھوٹ اور سارے سچ کے
جنجالوں سے مہلت ملتی
ہم آپس میں باتیں کرتے
سیدھی سچّی پیاری باتیں
جبر اور مکر سے عاری باتیں
تو شبنم تھا تو موتی تھا تو خوشبو تھا
میں پتا تھا میں پتھر تھا میں آنسو تھا
لیکن میل رہا دونوں کا
دونوں ہی نے اکثر
سُنا کہا دونوں کا
مالک
میں نے اکثر سوچا
تو جس کو
دِن کا آرام
نہ راتوں کی نیندیں حاصل ہیں
ساری دنیاؤں کی مسافت
کرتے کرتے
اپنے گلّوں اور گلّوں کے چرواہوں کی
چاہت کا دم بھرتے بھرتے
شہد کی نہریں زہر کے ساگر
تکتے تکتے
کبھی کبھی تھک جاتا ہوگا
تیرے گیسو
کاہکشاں کی دُھول سے اَٹ جاتے ہونگے

اور تیرے شانے
سارے زمانے کے انبار سے
دُکھتے ہوں گے
تیرے پاؤں
ازل سے لے کر ابد تلک
پھیلے ہُوئے صحراؤں کے سفر سے
چھالوں سے پٹ جاتے ہوں گے
اور تیرے پیوند لگے
ملبُوس کے بخیئے
شاید جگہ جگہ سے
نکل چکے ہوں
مالک
تو اِک روز اگر
سارے زمانے سارے ٹھکانے سارے فسانے
بھُول کے میرے پاس آئے تو
میں تیرے ریشم جیسے
لانبے بالوں کو
بستی کے واحد چشمے کے
چاندی جیسے پانی سے دھوؤں
تیرے تھکے ہُوئے شانوں کو
آہستہ آہستہ دابوں اور سہلاؤں
تیرے چھلنی چھلنی پاؤں کے تلوؤں سے
ساری تھکن کے کانٹے چُن لُوں
تیرے دریدہ پیراہن کے
اِک اِک چاک کو ٹانکوں
اور جب تجھ کو پیاس لگے
یا بھُوک لگے تو
سچے لفظوں کی سب سے اچھی بھیڑوں کا
خالص تازہ دودھ پلاؤں
اور پھر تجھ کو
اپنی نَے کی روتی ہوئی آنکھوں کے
سِسکتے گیت سُناؤں
تاکہ تو صدیوں کا جاگا تھکا ہوا
اس کھُلی فضا کے میدانوں میں
کچھ لمحوں کو سو جائے.... آرام کرے
مالک
تو میری باتوں پر
کتنی محبت سے ہنستا ہے
لیکن میرے عصر کے مُوسیٰ
برہم ہیں

O

رات اور چاند میں جب سرگوشی ہوتی ہے
یاد سے دل کی ہم آغوشی ہوتی ہے

اپنا گھر چھوڑا یا اُس کا دَر چھوڑا
اس کے بعد تو خانہ بدوشی ہوتی ہے

بوجھ وفا کا ہم نے اُٹھایا یا تم نے
ہم سفروں میں یہ ہمدوشی ہوتی ہے

بستی والے ایسے خوفزدہ کب تھے
اب تو خود سے بھی سرگوشی ہوتی ہے

آدھی رات کو زنداں کا دَر کھلتا ہے
اُس کے بعد طویل خموشی ہوتی ہے

حرف فروشوں کا میلا لگتا ہے فرازؔ
جب دربار میں بردہ فروشی ہوتی ہے

O

یہ میں بھی کیا ہوں اُسے بھول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اُسی کا رہا

وہ بت کہ دُشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو دَر اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دل نے سخن معتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کِس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فرازؔ
اسی لئے کفِ قاتل پہ سَر اُسی کا رہا

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!

تری بارگاہِ معلیٰ میں

عصیاں کے انبار سے سرنگوں

اِک گنہگار انساں کھڑا ہے

نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے

نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے

نہ ماتھے پہ محراب داغِ ریا ہے

یہ وہ بد مقدر ہے

جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے

غربال ہے

جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے

یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے

ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا

کہ جو تُو نے کاذب جہاں کو عطا کیں

یہ مجرم ہے

ان بے غرض جرأتوں کا

جو تو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں

یہ کہتا ہے

اے دائمی حکمتوں کے پیمبر

کہ انسان سارے برابر ہیں

ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے

یہ کہتا ہے

الفاظ سب سے مقدس ہیں

اور حرف کی روشنی سے

کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے

یہ سرکش

مقدر کو انساں کا رہوار کہتا ہے

آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے

کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے

اے روشنی کے پیمبر

یہ شوریدہ سر

حرف زن ہے

کہ محراب و منبر سے

فتویٰ گرو فتنہ پردازِ دیں

حرفِ حق بیچتے ہیں

فقیہانِ مسند نشیں

حرصِ دینار و درہم میں

تیرے صحیفے کا اِک اِک ورق بیچتے ہیں

یہ خلقت کا خوں

اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیمبر!

مجھے حوصلہ دے

کہ میں ظلم کی قوّتوں سے

اکیلا لڑا ہوں

کہ میں اس جہاں کے جہنّم کدے میں

اکیلا کھڑا ہوں

O

دِل منافق تھا شبِ ہجر میں سویا کیسا
اور جب تجھ سے مِلا ٹوٹ کے رویا کیسا

زندگی میں بھی غزل ہی کا قرینہ رکھا
خواب در خواب ترے غم کو پرویا کیسا

اب تو چہروں پہ بھی کتبوں کا گماں ہوتا ہے
آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں لبِ گویا کیسا

دیکھ اَب قُرب کا موسم بھی نہ سرسبز لگے
ہجر ہی ہجر مراسم میں سمویا کیسا

ایک آنسو تھا کہ دریائے ندامت تھا فرازؔ
دل سے بیباک شناور کو ڈبویا کیسا

O

اے خدا آج اُسے سَب کا مقدّر کردے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کردے

سانحے وہ تھے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
زخم یہ ہیں تو مرے دل کو بھی پتھر کردے

صرف آنسو ہی اگر دستِ کرم دیتا ہے
میری اُجڑی ہُوئی آنکھوں کو سمندر کردے

مجھ کو ساقی سے گلہ ہو نہ تنک بخشی کا
زہر بھی دے تو مرے جام کو بھر بھر کردے

شوق اندیشوں سے پاگل ہُوا جاتا ہے فرازؔ
کاش یہ خانہ خرابی مجھے بے در کردے

○

اپنی طرح ہی کوئی پریشانیوں میں تھا
اے شہرِ درد جو بھی ترے بانیوں میں تھا

میں بھی پھرا ہوں کشتیٔ عمرِ رواں لیے
وینس کا سارا شہر کھلے پانیوں میں تھا

کیا میرے زخم دیکھتی دنیا کہ ہر کوئی
مصروف اپنی چاک گریبانیوں میں تھا

اے دل ترے سکوں سے تری رونقیں گئیں
دریا کا سارا حسن ہی طغیانیوں میں تھا

صیّاد و گلفروش ہی خوش بخت ہیں فرازؔ
جو بھی چمن پرست تھا زندانیوں میں تھا

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تیری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
مین ناچ اُٹھین گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھُول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دُکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جُدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنّی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں
نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنون کا اجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانون سے لڑ چکا ہے
وہ تھک، چکا تھا اور اس کا تیشہ
اُسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
کواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہُوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھکتے ہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سُقراط ہیں
خواب منصُور ہیں

رباعی

اک راہ طویل اک کڑی ہے یارو
افتاد عجیب آ پڑی ہے یارو
کس سمت چلیں کدھر نہ جائیں آخر
دوراہے پہ زندگی کھڑی ہے یارو

غنچے کی چٹک سنائی دے گی یارو
ساغر کی کھنک سنائی دے گی یارو
زنداں کا سکوت گونج اٹھے گا جس سے
ایسی دستک سُنائی دے گی یارو

○

اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
فرازؔ انجمنِ دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی، نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

جو صدمے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُلجھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فرازؔ سو جائیں

رباعی

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

تھک جائیں گے راگیر چلتے چلتے
ڈھل جائیں گے ماحول میں ڈھلتے ڈھلتے
تاریکی شب میں نہ کمی آئے گی
بجھ جائیں گے یہ چراغ جلتے جلتے

○

اس ادا سے کبھی آ کر گزر و
دل کے صحرا کو بسا کر گز رو

سنگِ خارا ہے زمانے کی نظر
دل کے آئینے بچا کر گز رو

روشنی رہبرِ رہزن بھی تو ہے
راہیو! شمعیں بجھا کر گز رو

کون جانے کہ یہ پتھر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گز رو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گز رو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اُٹھا کر گز رو

چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گز رو

وقت نے ساتھ دیا ہے کس کا
جی میں جو آئے سدا کر گز رو

پہلے دیوانوں کی رسمیں تھیں یہی
خون کانٹوں کو پلا کر گز رو

ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اُڑا کر گز رو

یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گز رو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آ کر گز رو

تو سنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گز رو

فکر و ادراک کے درّوں میں فرازؔ
مشعلِ طبع جلا کر گز رو

O

نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے
پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے کیا کیا جائے

ہمیں بھی عرضِ تمنا کا ڈھب نہیں آتا
مزاجِ یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے کیا کیا جائے

وہ مہرباں ہے مگر دل کی حرص بھی کم ہو
طلب، کرم سے زیادہ ہے کیا کیا جائے

نہ اس سے ترکِ تعلق کی بات کر پائیں
نہ ہمدمی کا ارادہ ہے کیا کیا جائے

سلوکِ یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فرازؔ
مگر یہ محفلِ اعداء ہے کیا کیا جائے

○

میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری
اسے خبر ہی نہ تھی، خاک کیمیا تھی میر

میں چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ بات ختم ہوئی
پھر اس کے بعد تو آواز جا بجا تھی مری

کہیں دماغ کہیں دل کہیں بدن ہی بدن
ہر اک سے دوستی یاری جدا جدا تھی مری

جو طعنہ زن تھا مری پوششِ دریدہ پر
اسی کے دوش پہ رکھی ہوئی قبا تھی مری

کوئی بھی کوئے محبت سے پھر نہیں گزرا
تو شہرِ عشق میں کیا آخری صدا تھی مری؟

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں، یہی سزا تھی مری

جو اب گھمنڈ سے سر کو اٹھائے پھرتا ہے
اسی طرح کی تو مخلوق خاکِ پا تھی مری

شکست دے گیا اپنا غرور ہی اس کو
وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری

ہر ایک شعر نہ تھا در خورِ قصیدۂ دوست
اور اِس سے طبعِ رواں کوب آشنا تھی مری

میں اُس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فرازؔ
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

صراف

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتھر پہ رگڑ اِس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اِک طور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اِس جنسِ گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدّت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تری دوکاں کے یہ زرّیں زیور
یہ گلو بند یہ کنگن یہ طلائی پیسے
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری
کسی شدّاد کا تابوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لئے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں
پہلے تو رہن کیے بعد ازاں بیچ دیے

تیری میزان کے یہ بے رحم سنہرے پلڑے
ایک جلاد کی تلوار رہے ہیں اب تک
گرسنہ آنکھوں کے کشکول، ہوس کے مقتل
ہر نئے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساٹھ کے تیس نہیں، تیس کے پندرہ دے دے
اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا
آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کرسکتا

O

اُن کے وعدوں پہ یقیں، لوگ بھی دیوانے ہیں
اک فقط میں ہی نہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی موردِ الزام مگر
اے مر زہرہ جبیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشِ جام کہاں، گردشِ ایام کہاں
یہ خرابات نشیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمانِ دو عالم ہیں حضور
آپ اور دشمنِ دیں لوگ بھی دیوانے ہیں

ایک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

دردمندانِ محبت تو ہیں بدنام فرازؔ
ورنہ کچھ یہ حسیں لوگ بھی دیوانے ہیں

O

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سورج بجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقفیت، فضا بیگانہ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہوروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کرلیتے ہیں پیدا آشنا

خلق شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دیرا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فرازؔ
دوست دشمن کا نِکل آیا ہے اپنا آشنا

خریدار

دلِ بے تاب کی موہوم سی تسکیں کے لیے
اِک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
آج کی رات بھی تُو اپنے دریچے کی طرف
حسبِ معمول نئی شان سے اِستادہ ہے
"تیرتے ہیں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا"
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن
اب یہ عالم ہے کہ احساسِ تہی دستی سے
تیرے زینے کی طرف تیرے دریچے کی طرف
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتیں

O

انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چُپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چُپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر
مرغانِ گرفتار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اِس شہر میں ہر جنس بنی یوسفِ کنعاں
بازار کے بازار بڑی دیر سے چُپ ہیں

پھر نعرۂ مستانہ فرازؔ آؤ لگائیں
اہلِ رسن و دار بڑی دیر سے چُپ ہیں

O

ہر ہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کِس کِس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہوتا ہے کون کون جُدا دیکھتے رہو

ہر فصلِ گل ہے غیر یقینی سی اِن دنوں
صر صر چلے کہ باشِ صبا دیکھتے رہو

سُنتے رہو کہ وقت نے دلی ہے راگنی
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرۂ منصور بھی گراں
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یارو پلک جھپکتے ہی لُٹتے ہیں قافلے
یاں خود کشی ہے نعزش پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دارو رسن تک پہنچ گئے
اور تم فرازؔ دستِ صبا دیکھتے رہو

O

کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دُور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نشے میں چُور ہوں میں بھی تمہیں بھی ہوش نہیں
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
ابھی ہے دُور سحر تھوڑی دُور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فرازؔ تم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

مجسمہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دورِ المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

تیرے شب رنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو انہیں دنیا نے

ریشۂ سنگ سے کھینچی ہوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہیں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ سناٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے ستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
ریگزارانِ حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیش کے لیے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

O

عرضِ غم کبھی اُس کے روبرو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے، گفتگو بھی ہو جائے

زخمِ ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتے ہیں، دل رفو بھی ہو جائے

رند ہیں بھر بیٹھے اور مے کدہ خالی
کیا بنے جو ایسے میں ایک "ہو" بھی ہو جائے

میں اِدھر تنِ تنہا اور ادھر زمانہ ہے
وائے گر زمانے کے ساتھ، تو بھی ہو جائے

پہلی نامرادی کا دکھ کہیں بسرتا ہے
بعد میں اگر کوئی سُرخ رُو بھی ہو جائے

دین و دل تو کھو بیٹھے اب فرازؔ کیا غم ہے
کوئے یار میں غارت آبرو بھی ہو جائے

○

چلو کہ کوچۂ دلدار چل کے دیکھتے ہیں
کسے کسے ہے یہ آزار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ایسا مسیحا کہیں سے آیا ہے
کہ اس کو شہر کے بیمار چل کے دیکھتے ہیں

ہم اپنے بت کو، زلیخا لئے ہے یوسف کو
ہے کون رونقِ بازار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دیر و حرم میں تو وہ نہیں ملتا
سو اب کے اس کو سرِ دار چل کے دیکھتے ہیں

اس ایک شخص کو دیکھو تو آنکھ بھرتی نہیں
اس ایک شخص کو ہر بار چل کے دیکھتے ہیں

وہ میرے گھر کا کرے قصد جب تو سائے سے
کئی قدم در و دیوار چل کے دیکھتے ہیں

فرازؔ اسیر ہے اس کا کہ وہ فرازؔ کا ہے
ہے کون؟ کس کا گرفتار؟ چل کے دیکھتے ہیں

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے وہ شہر ہمارا کیسا ہے
سب دوست ہمیں پیارے ہیں مگر وہ جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزمِ حریفاں سجتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے
جب بھی میخانے بند ہی تھے اور دارِ زنداں رہتا تھا
اب مفتئی دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے
میخانے کا پندار گیا پیمانے کا معیار کہاں
کل تلخی مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے
ملکوں ملکوں گھومے ہیں بہت جاگے ہیں بہت روئے ہیں بہت
اب تم کو بتائیں کیا یارو دنیا کا نظارا کیسا ہے
یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارہ کیسا ہے

کیا کوئے نگاراں میں اَب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
اہلِ دِل نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے
کیا اَب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اَب وقت کا دھار کیسا ہے
قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی
وہ بھی تو خبر رکھتا ہو گا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے
ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہُوا ہر درد کا مارا کیسا ہے
کہتے ہیں کہ گھر اَب زنداں ہیں سنتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے
پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت دیکھو
جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے دِل پارا پارا کیسا ہے
اے دیس سے آنے والے مگر تم نے تو نہ اتنا بھی پوچھا
وہ کوی جسے بن باس ملا وہ درد کا مارا کیسا ہے

O

جسَ کے لئے ہیں جاں بلب، اس کو نہیں ملال بھی
اے دلِ ناصبور اب عادتِ ہجر ڈال بھی

دامنِ یار تک کہاں عشقِ زبوں کی دسترس
حشمتِ حسن دیکھ کر بھول گیا سوال بھی

کب سے ہیں لوگ سر بکف، راہ میں مثلِ آہواں
اب تو مرے شکار خُو، تیر و کماں سنبھال بھی

جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اس کے بغیر کٹ گئے کس طرح ماہ و سال بھی

اس کے خرامِ ناز سے ایسی قیامتیں اٹھیں
اب کے تو مات کھا گئی چرخِ کہن کی چال بھی

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدّ و خال بھی

اب کے فرازؔ وہ ہوا جس کا نہ تھا گمان تک
پہلی سی دوستی تو کیا ختم ہے بول چال بھی

O

کل ہم نے بزمِ یار میں کیا کیا شراب پی
صحرا کی تشنگی تھی سو دریا شراب پی

اپنوں نے تج دیا ہے تو غیروں میں جا کے بیٹھ
اے خانماں خراب! نہ تنہا شراب پی

تو ہم سفر نہیں ہے تو کیا سیرِ گلستاں
تو ہم سبو نہیں ہے تو پھر کیا شراب پی

اے دل گرفتۂ غمِ جاناں سبو اٹھا
اے کشتۂ جفائے زمانہ شراب پی

دو صورتیں ہیں چارۂ دردِ فراق کی
یا اُس کے غم میں ٹوٹ کے رویا شراب پی

اک مہربان بزرگ نے یہ مشورہ دیا
دکھ کا کوئی علاج نہیں، جا شراب پی

بادل گرج رہا تھا ادھر محتسب اِدھر
پھر جب تلک یہ عقدہ نہ سلجھا شراب پی

اے تو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
اک روز اس فقیر کے گھر آ، شراب پی

دو جام ان کے نام بھی اے پیرِ میکدہ
جن رفتگاں کے ساتھ ہمیشہ شراب پی

کل ہم سے اپنا یار خفا ہو گیا فرازؔ
شاید کہ ہم نے حد سے زیادہ شراب پی

O

کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
وگر نہ زندگی ہم نے بھی کیا سے کیا نہیں کی

ہر اک سے کون محبت نباہ سکتا ہے
سو ہم نے دوستی یاری تو کی، وفا نہیں کی

شکستگی میں بھی پندارِ دل سلامت ہے
کہ اس کے در پہ تو پہنچے مگر صدا نہیں کی

شکائت اس کی نہیں ہے کہ اُس نے ظلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

وہ ناد ہند اگر تھا تو پھر تقاضا کیا
کہ دل تو لے گیا قیمت مگر ادا نہیں کی

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فرازؔ
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں بجھا نہیں کی

قاصد کبُوتر

یہ لہُو

جس سے مرے

شہروں کے سارے راستے

گلگوں ہیں

اور ہر پیرہن کا رنگ عُنابی ہے

کل کے موسموں

اور آنے والے سُورجوں

کا زمزمہ گر ہے

چلو تُم نے تو

کالی سُرخیاں

مقراض کر ڈالیں

سخن نخچیر کر ڈالے

قلم زنجیر کر ڈالے

مگر اب ان ہواؤں کو بھی روکو

جو تمہارے مقتلوں کی لالیاں

اور تازہ خوں کی خوشبوئیں

اور اُن کی آوازیں لیے

گلیوں سے

بازاروں سے

شہراہوں سے ہو کر

ہر طرف

قریہ بہ قریہ

پھیلتی جاتی ہیں

نادانو

ہوائیں نامہ بر بنتی ہیں

جب قاصد کبُوتر قید ہوتے ہیں

○

اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہُوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اُتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدّر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہَوا میں مست پھرتا ہے فرازؔ
شہرِ ناپُرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

O

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دُکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گِلہ کیا، کہ یہ جہاں والے
کبھی کبھی ترا دل بھی دُکھانے لگتے ہیں

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک جھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

فرازؔ ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

پسِ مرگ

وہ لاشوں پر نمبر لکھ دیتے ہیں
نعش خانے کے نمبر
ماتھوں کی قطاریں
چہروں کا جنگل
خاردار آنکھوں کے نیچے
کبھی ان کے ماتھوں کے پیچھے
دماغ دھڑکا کرتے تھے
جن دھڑکن
ایک للکار تھی
طاقت عوام کی ہے
مبازرت کا نعرہ
ابھی بھی گونج رہا ہے
بچوں کے جلے ہوئے سکول کے خاستر سے
اٹھتا ہو نعرہ

معصوم ہونٹوں سے پھوٹ کر
بزرگوں کے دہنوں سے

اٹھتا ہوا نعرہ
کانوں
کارخانوں
اور کھیتوں کے حلقوم سے اٹھتا ہوا نعرہ
خوشنما پرندے کے گلے سے اٹھتا ہوا نعرہ
اِس کٹھالی سے
اُس بھٹی سے
چنگاری کی طرح
اڑتا ناچتا چکراتا ہوا
تُندی سے
لوہے کی سلاخ کی مانند
سرخ گرم ہوا میں جذب ہو جاتا ہے
یہ سویٹو کے انگارہیں
جو گوگولیٹو کے دل کو آتش فشاں کر رہے ہیں
جو بوں ٹیو ہول کے پھولوں کی طرح آتشیں ہیں

سنو
دہتکے ہوئے انگاروں کو چھوتی ہوئی

مجاہد بچے کی آواز

گرتے ہوئے بچے کی آواز

سنو

اے ماں

اے بابا

اے لوگو

آزادی کی توپ داغی جا رہی ہے

"مرتے ہوئے بچے کے ہونٹوں پر

نعرہ سوکھ جاتا ہے"

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں
ابھی ابھی سب نے دیکھا
یہاں آٹھ برس کی
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
اس کے بال
نوکدار نوٹیوں میں گندھے تھے
اس نے معصومیت سے
(پولیس کو)
احتجاجاً مکہ دکھایا
اس کے بعد
دیکھنے والوں نے دیکھا
سرخی ہی سرخی پھیل گئی
کچھ گوشت کے لوتھڑے
کچھ پھڑ پھڑاتے ہوئے
رنگدار چیتھڑے
زمین پر بکھرے پڑے تھے
ابھی ابھی
یہاں پھولدار سرخ کپڑوں میں
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
ابھی ابھی........
لوگ کہتے ہیں

نفرت کی نمو

میری طرف دیکھو
اِدھر
میری آنکھوں میں
میرے تیوروں کی گہرائیوں میں
کوئی بے یقینی کوئی خوف نہیں
بلکہ
وہ کالی خوبصورتی ہے
جو طوفان سے پہلے
گھٹاؤں سے بوجھل آسمانوں میں
نظر آتی ہے
ان میں
تہہ بہ تہہ
نفرت کی سرخ تمتماہٹ
دکھائی دے گی

تمہاری آنتیں تمہارے اندر کا سب کچھ
گندگی کے ڈھیر پر پھینکنے کے ارادے سے
کپکپاہٹ اور رعشہ آ گیا ہے
اس کے لیے مجھے
بڑے بڑے ناخون پالنے کی ضرورت نہیں
کہ تم نے خود ہی
میرے اندر
لازوال نفرت کو
پروان چڑھایا ہے
میرے منہ کو دیکھو
اس کی لکیریں
میرے دل پر پڑی ہوئی خراشوں کا
عکس مہیں
یہ میری جاوداں مزاحمت
اور تمہیں شکست دینے کا
عہد نامہ ہیں

میرے کالے اور مضبوط ہاتھوں کو دیکھو
جن میں تمہارے نرخرے کو پھاڑ کر

میرے ماتھے کی نالیوں جیسی گہری لکیروں سے
بل کھاتا ہوا پسینہ

زمین کو اس طرح داغ داغ کر دے گا

جیسے بے بسی میں

غصے کے کڑوے آنسوؤں سے

ہمارے دل زخم زخم ہیں

مجھے ابھی تک

سکول جاتے ہوئے

نوعمر سیہ فام بچوں کے خون کے فوارے یاد ہیں

جن کے قدموں کی آوازوں کو

گرد سے اٹی ہوئی گلیاں

اب کبھی نہ سُن پائیں گی

میری آنکھوں کے گوشوں کی سلوٹیں

اپنی موجودہ حالت پر ٹھہری رہیں گی

اس شرمناک منظر کو اوجھل ہونے سے بچانے کیلئے

جب تمہاری گولیوں کی بوچھاڑ سے

خوفزدہ ہو کر

دس اور بارہ برس کے نوعمر بچے

کوڑے کے ڈبوں کے ڈھکنوں کے پیچھے

پناہ لیتے وقت

چھلنی ہو ہو کر گر رہے تھے

اس روز میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا

اور میری آنکھیں

جب سے کھلی ہیں اور ان کی سلوٹیں

جب سے اسی زاویے پر ٹھہر گئی ہیں

تا کہ تم انہیں

اس وقت تک نہ بھٹکا سکو

جب تک

میں ان شہید بچوں کا

انتقام نہ لے لو

نئی مُسافت کا عہد نامہ

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
جو میرے دیوار و در سے ٹپکا
تو شاہراہوں تک آ گیا تھا
جہاں کسی کو گماں نہیں تھا
مرا لہو رائیگان نہیں تھا
مرے مقدر میں آبرو
کی تمام لمبی مسافتیں تھیں
مرے سفر میں حسینؑ کے سر، مسیحؑ کے جسم
کی سبھی دردناکیاں تھیں، اذیتیں تھیں
مگر مرا درد بے وقر تھا
مگر مرا دشت بے شجر تھا
یہ بات برسوں کی ہے....... تو ہو
پردہ ساعتیں اب بھی نوحہ گر ہیں

جہاں کہیں بھی ہجوم ہوتا
تو سب مری سمت دیکھتے
اور طنز کرتے
کہ اس کو دیکھو
یہ کون پیکر ہے
جس کا چہرہ نہیں
میں اُن سے کہتا
کہ مَیں تم ہی میں سے ہوں
یہ دیکھو
یہ میری مٹی یہ میری دنیا یہ خواب میرے
وہ مجھ سے کہتے
کہ تیری مٹی کو تیری دنیا کو تیرے خوابوں کو کون دیکھے
کہ تیری آنکھیں نہیں
میں اُن سے کہتا کہ
میرے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں صداقتوں کی، رفاقتوں کی
وہ مجھ سے کہتے
بدن تو دیوار کا بھی ہوتا ہے
ہاتھ اشجار کے بھی ہوتے ہیں
جن کی شاخوں کی نوک پر
صرف ایک پتا لرزتا رہتا ہے
پردہ دیوار اور وہ اشجار ہم نہیں ہیں
میں ان سے کہتا
کہ مجھ کو دیکھو
نہ میری گردن میں طوق ہے
اور نہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
مگر وہ کہتے

بہت سے محکوم بے رسن ہیں
کہ دست و پا کی کشادگی کا عذاب
حیواں بھی جھیلتے ہیں
پر اُن کے ماتھوں کی لوح پر
کوئی نام کندہ
نہ اُن کے چہروں پہ
عہد نامہ کوئی رقم ہے
یہ عہد نامہ
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہے ثبات بھی ہے
میں نسلِ آدم کے اس قبیلے کا فرد تھا
پر کوئی مجھے جانتا نہیں تھا

میں اپنے ایثار کے فسانے انہیں سناتا
مگر کوئی مانتا نہیں تھا
ہم ایک جیسے تھے
پر گروہِ الم کشاں میں
کوئی بھی اک دوسرے کو پہچانتا نہیں تھا
کہ سب کے چہرے تھے سب کے ماتھے تھے
اور ماتھوں پہ
عہد نامے لکھے ہوئے تھے

محبتوں کے صداقتوں کے
سفر کی ساری رفاقتوں کے
بیافرا کی پہاڑیوں
عیت نام کے جنگلوں
بلا کی قیامتوں کے
تمام پیکر تمام چہرے تھے
آئینے ان علامتوں کے
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں
میں سر بریدہ پلٹ کے آیا
تو ساتھ سارے نشان لایا
اَنا رکے
پندار کے
وفا کے
مرا لہو ندیوں کی صورت بہا تو قلزم بنا گیا ہے
مرا لہو پھیل کر
مری خوش نہاد مٹی کی سرحدوں کو بچا گیا ہے
وہ میرے چہرے پہ ایسی آنکھیں لگا گیا ہے
جو دوسروں سے عظیم تر ہیں
جو سب کی نظروں میں معتبر ہیں
وہ زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں

احمد فراز کے ڈراموں سے انتخاب

سپاہی

اور

موت

کردار:۔

- زخمی سپاہی
- پہلا سپاہی
- دوسرا سپاہی
- موت

(ہوائی جہازوں کی بمباری.......... مورچے، لڑائی کا منظر.....
آہستہ آہستہ کیمرہ ایک پہاڑ کی طرف رُخ پھر لیتا ہے جہاں برف
سے ڈھکی چوٹی پر ایک زخمی سپاہی برف میں دبا پڑا ہے۔)

سپاہی: کہاں ہوں
مرے جسم پر بوجھ کیسا ہے
کیا میں پہاڑوں کے نیچے دبا ہوں
مری سانس کیوں رُک رہی ہے
یہ ٹھنڈک رگ وپے میں کیوں ہے
مرے بازوؤں میں سکت ہے
نہ ہونٹوں میں جنبش کا یارا
نہ آنکھوں میں ہی روشنی ہے

چٹانوں کی صورت گرانبار پلکیں اُٹھانے سے عاری
تو کیا میری بینائی بھی جا چکی ہے؟
نہ چہرے، نہ منظر
نہ کوئی صدا ہے؟
یہ کیا ہے؟
مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی ہے
فقط دھند ہی دھند
اور برف کے بیکراں سائباں چار سُو ہیں
یہ سکرات کا پَل ہے
یا مجھ پہ کابوس سایہ کناں ہے
.... یہ کیا؟
میرے بازو میں کیوں درد کی لہر اُٹھی
میں زندہ ہوں
لیکن
بدن برف میں دفن ہے
اور چہرہ مرا
زمہریری ہواؤں سے سُن ہو چکا ہے
کسی کو خبر تک نہ ہوگی
کہ میں اس پہاڑی کی چوٹی پہ زخموں سے چھلنی پڑا ہوں
کوئی مہرباں ہاتھ .... ہمدرد بازو نہیں ہے

جو اس کرہ مرگ سے مجھ کو باہر نکالے

نہ جانے بہادر رفیقوں کے دستے کہاں ہیں

تو کیا میں یہاں

کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دوں گا

تو کیا اِس پہاڑی کی چوٹی پہ میرے تجسّس میں کوئی

نہ آئے گا

کوئی نہ آئے گا

کوئی..........

موت: مگر میں سپاہی

فقط میں۔اجل۔موت

ازل سے ابد تک

تری غمگسار اور ساتھی

اکیلے دُکھی بے نواؤں کی واحد مسیحا

کہ جو زندگی کی کڑی اور لمبی مسافت سے اکتا چکے ہوں

کہ جو زندگی کے سرابوں سے،

پھیلے خرابوں سے گھبرا چکے ہوں

سبھی نامرادوں کو میں نے ہی آخر سہارا دیا ہے

جنہیں زندگی تج گئی ہو

انہیں صرف میں نے گوارا کیا ہے

ادھر آ.......... مجھے ہاتھ دے

میں تری آخری چارہ گر ہوں

تری ہمسفر ہوں

تری راہبر ہوں (موت ہاتھ بڑھاتی ہے)

ادھر آ سپاہی۔ مرے ساتھ چل

یہی وقت ہے

جبکہ تو اِک چراغِ سحر کی طرح

رہگزار، عدم کا مسافر ہے

آ تجھ کو اپنی حفاظت میں

اس برف کے تند طوفان سے لے چلوں میں

تجھے کیا خبر

کیسی قاتل ہواؤں کے جھکڑ

ہمارے تعاقت میں ہیں

اے سپاہی مرے ساتھ چل

(ہواؤں کا شور)

سپاہی: کون ہے تو

اجل

فاحشہ!

تجھ کو کس نے پکارا کہ تو

بن بلائے یہاں آ گئی ہے
میں زندہ ہوں
میری نقاہت سے تُو نے یہ سمجھا
کہ میں زندگی سے مفر چاہتا ہوں
مری غیر ہموار سانسوں سے تو نے یہ جانا
کہ میں نزع میں ہوں
پرے ہٹ مرے جسم سے اپنی پرچھائیں کو دُور لے جا

موت: ترا جسم بے حس ہے
اور تیری آنکھوں پہ کہرا جما ہے
تجھے اس کا احساس بھی تو نہیں ہے
کہ تو صرف کہنے کو زندہ ہے
ورنہ اگر تو یہ دیکھے
کہ تیرا لہو کس قدر بہہ چکا ہے
اگر تو یہ دیکھے
کہ یہ لعل و یاقوت
جو تیرے پہلو مین بکھرے پڑے ہیں
ترے ہی لہو کی وہ بوندیں ہیں
جو برف پر جم گئی ہیں
تو جانے

کہ اب زندہ رہنے کی خواہد عبث ہے

چلو میں نے مانا

کہ تجھ میں ابھی زندگی کی رمق ہے

مگر کس قدر

صرف دو چار سانسون کی مہلت

تری بے بسی اور نقاہت کا یہ حال ہے کہ

ترے زرد رخسار پر برف کی تہہ جمی ہے

مگر تجھ میں اتنی بھی ہمّت نہیں ہے

کہ چہرے سے اِس کو کھرچ دے

....

ترے سامنے جو اندھیرے ہیں ان سے نہ ڈر

بے خبر

رات بھی دن سے کچھ مختلف تو نہیں ہے

سپاہی: چلو میں نے مانا

مگر تو بتا مجھ سے کیا چاہتی ہے

موت: زیادہ نہیں

صرف اِتنا کہ تُو مان لے

زندگی اک مسلسل اذیت ہے

تو جس سے تنگ آ چکا ہے

سپاہی: تو.......

تو یوں کہہ کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت: کیوں نہیں

اور یہ الزام بھی کود پہ لینے کو راضی ہوں میں

سپاہی: دور ہٹ فاحشہ!

زندگی سے مجھے پیار ہے

موت: باؤلے!

اتنا پاگل نہ بن

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

اب ترے سامنے دوسرا راستہ ہی نہیں

اپنے ہاتھوں کی پیلاہٹیں دیکھ لے

اپنے ہونٹوں کی نیلاہٹیں دیکھ لے

اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹیں دیکھ لے

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

سپاہی: دشمنِ جاں!

موت: ضد نہ کر دیکھ

اب تیری منزل

تری رات ہر لحہ نزدیک تر آ رہی ہے
تری جد
تیری بیچارگی
کرب واندوہ کو طول دے گی
جانکنی زندگی تو نہیں
چل مرے ساتھ چل
زندگی کے کڑے مرحلے بھول کر
چل۔

سپاہی: نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا
میں ترے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا

موت: اپنا دشمن نہ بن
تیرے پیکر مین تیرا لہو منجمد ہو رہا ہے
ترا یخ زدہ جسم
طوفان کی یورشوں سے نہیں بچ سکے گا
ادھر آ تجھے اپنا آنچل اوڑھا دوں
جو تجھ کو قیامت تلک گرم رکھے گا
ادنا سمجھ نو جواں
میرے سینے کی حدّت
ترے یخ زدہ جسم کو
سرمدی امن بخشے گی

آ تجھ کو اپنے گلے سے لگا لوں

یقیں کر!

کہ تو کربنا کی شدّت سے نالہ کناں ہے

تری بے کسی اور فرماں پذیری

مجھے حوصلہ دے رہی ہے

سپاہی: فریبی!

مجھے اپنی حیلہ گری اور مکّاریوں سے

تہہِ دام لانے کی کوشش نہ کر

کذب گو

میں تو سردی کی شدّت سے بیکل ہوں

تجھ سے تو خائف نہیں۔

موت: خواہ آنسو خوشی کے ہوں یا کرب کے

ایک ہی بات ہے

بے خبر!

شام ڈھلنے کو ہے

اور میدان میں

شب کی پرچھائیاں خیمہ زن ہو رہی ہیں

کسے کیا خبر ہے

کہ تو

اس پہاڑی پہ گھائل پڑا ہے

تری کھوج پہلے تو مشکل ہے
اور اتفاقاً اگر تیرے ساتھی
تجھے ڈھونڈ بھی لیں
تو حاصل؟
تجھے کیا سکوں مل سکے گا؟
اگر تُو کوئی روز تک اور زندہ رہا بھی تو کیا
پھر سے دُنیا کے دُکھ
زندگانی کے جنجال تیرا تعاقب کریں گے
تری بہتری ہے اسی میں
کہ بے حیل و حجت
یہاں پُرسکوں موت مرجا

سپاہی: ریاکار!
تو اپنی عیاریوں سے مجھے دام مین پھانسنا چاہتی ہے
میں زندہ رہا ہوں
میں زندہ ہوں
زندہ رہوں گا
مجھے تُو ہراساں نہیں کر سکے گی
ابھی مجھ کو جینا ہے

موت: گر تو جیا بھی تو پھر کیا؟
تجھے زندگانی کے بارے میں خوش فہمیاں ہیں

اگر تو جیا بھی
تو کیا تو سمجھتا ہے
اس زندگی سے محبت کرے گا
جو ٹھرن ہے ذلّت ہے بیچارگی ہے
ذرا سوچ اے بے خبر
زندگی بسترِ گل نہیں
پھر ذرا سوچ

سپاہی: کیا سوچنا
میں تو ہستی کے ہر زیر و بم سے ہوں واقف
مگر تو بھلائے ہُوئے ہے
کہ یہ جنگ ہے

موت: باؤلے!
میں نے مانا کہ تُو جنگ میں
سرخرو ہو چکا ہے
وطن کی حفاظت کا حق
جان پر کھیل کر تو ادا کر چکا ہے
مگر تجھ کو اِک مرتبہ اپنے گھر اور عزیزوں کے دُکھ پھر سے
تڑپائیں گے
سب زمانے کے غم تجھ کو کھا جائیں گے

سپاہی: جبھی تو مجھے اس قدر بے کلی ہے

کہ میں حملہ آور غنیموں کو جلدی ٹھکانے لگالوں
تو پھر گھر کو جاؤں
مرے گھر کی دہلیز ہر دم مری منتظر ہے

موت: بجا ہے
اگر گھر ترا منتظر ہو
اگر تیرے گھر کے در و بام باقی رہے ہوں؟
اگر صرف اینٹوں کے انبار اور راکھ کے ڈھیر گھر ہیں
تو پھر وہ ترے منتظر ہیں

(قہقہہ)

کھنڈر چاروں جانب کھنڈر ہیں

سپاہی: تو پھر کیا؟
مرے بازوؤں میں توانائی ہے
میرے کندھون سے بندوق اُترے تو پھر میرے بازو
کدالوں کے اور بیلچوں کے رفیق سفر ہیں
سپاہی خرابون کو تعمیر کرتا رہا ہے

موت: زمیں جل چکی ہے

سپاہی: مین پہلے بھی ویران خطوں کو زرخیزیاں دے چکا ہوں

موت: مگر اب یہ ممکن نہیں ہے
کہ پانی کے چشمے۔ کنویں اور نہریں
بموں کی لگاتار بارش سے اب خشک اور بے نشاں ہو چکے ہیں

درانتی۔ ہتھوڑے۔ سلاخیں۔ کدالوں کے پھل اور
ہل۔ گویا سب تیرے اوزار۔ ہتھیار ٹوٹ مُڑ چکے ہیں

سپاہی: مگر تابکے
میں سپاہی ہوں
گر بخت نے یاوری کی
اور اک بار میرے قدم
اپنے شہروں میں پہنچے
تو پھر سے
یہ مسمار گھر
منہدم کارخانے
جلی کھیتیاں
اور خاموش بازار
یوں جی اُٹھیں گے
کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا

موت: بجا
پر یہ اُس وقت ممکن ہے

سپاہی: لیکن............

موت: ٹھہر تو مری بات سن
یہ تو اُس وقت ممکن ہے جب
تیرے بازو سلامت ہوں اور جسم کا کوئی حصّہ نہ بیکار ہو

مگر ایسے عالم میں بھی

تیری خوش فہمیاں تجھ کو بہکا رہی ہیں

ہلاکت کی آندھی ترے جسم کا ریزہ ریزہ اُڑانے کو پر تولتی ہے

ابھی وقت ہے سوچ لے

سپاہی: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہُوئے اپنے آپ سے) تو کیا کوئی قوت بھی

ایسی نہیں ہے

کہ جو موت کے زعم و پندار کو چُور کر دے

کوئی ایسی صورت نہیں

جس سے میں قلعۂ مرگ کو منہدم کر سکوں

نہیں....... آج تک موت پر کس کو قدرت ملی

اگر یُونہی ہوتا رہا ہے

تو پھر کیوں نہ میں خود کو اس کے حوالے ہی کر دوں

کشاکش کا حاصل؟

فقط نزع کا طول۔ اور پھر

ہزیمت شکستِ نفس

(موت کی طرف دیکھتے ہوئے)

موت!

میں صرف اِک شرط پر زندگی کی متاعِ گراں تیرے قبضے میں دینے کو تیار ہوں

موت: شرط!

(قہقہہ لگاتی ہے)

بھلا موت سے بھی کسی نے کوئی شرط منوائی ہے؟

سپاہی: جانتا ہوں کہ میں

دوسروں سے کسی طرح بہت نہیں ہوں

اگر آج تک کوئی تجھ سے نہ جیتا

تو مجھ کو بھی مرنے میں پھر عذر کیوں ہو

مگر دشمنِ زندگی

صرف اک شرط پر

موت: کونسی شرط؟

سپاہی: بس یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو تو اک روز کے واسطے تو مجھے چھوڑ دیگی

بس اک روز کے واسطے

تا کہ میں اپنے غازی رفیقوں کی صف میں کھڑا،

فتح کے گیت گاؤں

ظفر مند پرچم کھلے تو

سلامی کی تقریب میں

دوسرے جاں نثاروں کے ہمراہ میں بھی کھڑا ہوں

مرے کان بھی یومِ نصرت کی توپوں کی گونجار سے گونج اٹھیں گے

اور اُس وقت

جب فتح و نصرت کے نغمات سے

سرزمینِ وطن کی فضا رقص میں ہو

میں عجلت سے گھر جا کے دیکھوں

وہ محبوب چہرے

جو میرے لیے اپنی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو تو

ہاتھوں میں پھولوں کے کنٹھے لیے راستوں پر مرے منتظر ہوں

مرے گاؤں والے

مرے یار احباب مجھ کو

ظفر مند پرچم کی مانند اُٹھا لیں.........

اور میں

ان کے اس خیر مقدم کو

مسکراہٹ سے دیکھوں

دشمن!

موت: نہیں تیری یہ شرط نا قابلِ اعتنا ہے

سپاہی: تو پھر بیسوا!

دور ہو۔ میں سپاہی ہوں

اور زندگی کی چمکتی دمکتی ہُوئی آگ میرے بدن میں ابھی ہے

میں زندہ ہوں۔ زندہ رہوں گا

موت: مگر کب تلک

سپاہی: جب تلک میری آواز میں زندگی کی لپک ہے

مرا دل دھڑکتا رہے گا

موت: مگر تابکے

سپاہی: تابکے؟

جب تلک یہ مرانخ زدہ جسم اِن آسمانوں کی مانند نیلا نہ ہو جائے

میں

اِس پہاڑی کی چوٹی پہ دم توڑ دوں گا

مگر تیرے آگے نہ ہرگز جھکوں گا

یہ ممکن نہیں ہے

کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت: حوصلہ! حوصلہ!

اے سپاہی یہ جذباتیت بے اثر اور عبث ہے

اگر مجھ سے تُو ہار تسلیم کر لے

تو یہ زندگی کے اُسی ضابطے ہی کی تائید ہو گی

جو روزِ ازل سے ابد تک رہا ہے

رہے گا

نہ اس سے زیادہ نہ کمتر

نہ اس سے زیادہ نہ کمتر

(قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے کچھ دور سپاہیوں کے چہرے جن
میں سے ایک کے کندھے پر برف ہٹانے والا کدال اور دوسرے کے
کندھے پر تہہ کیا اسٹریچر دھرا ہے۔)

سپاہی: ٹھہرا

مرے ہی رفیقوں کے قدموں کی مانوس آواز میری طرف
بڑھ رہی ہے عجب کیا کہ یہ زخمیوں کے تجسّس میں ہی
آرہے ہوں

موت: کہاں بے وقوف

سپاہی: اُس طرف

موت: (دیوانہ وار ہنستی ہے۔قدموں کی چاپ قریب تر آجاتی ہے)
باوٗلے یہ جماعت تو وہ ہے جو لاشیں ٹھکانے لگاتی ہے
سُن تو!
(کدالوں اور بیلچوں کے کھڑے کنے کی آواز)
یہ تیرے درماں نہیں گورکن ہیں

سپاہی: وہ کچھ بھی ہوں زندہ تو ہیں اور زندوں کے دشمن نہیں
یہ مرے شیر دل ہم وطن ہیں
(کیمرہ بلندی سے گھاٹی پر مرکوز ہوتا ہے)

پہلا سپاہی: بہت تھک گئے
اس پہاڑی پہ چڑھنا غضب تھا

دوسرا سپاہی: یہاں چند سانسوں کو ستانے کے بعد
آگے بڑھیں گے

کہ اب اور چلنے کی طاقت نہیں ہے

پہلا سپاہی: تھکن سے مری ہڈیاں
ریزہ ریزہ ہوئی جا رہی ہیں

پہلا: ترے پاس کھانے کو ہے کچھ؟

دوسرا: کہاں۔ چند سگریٹ بچے ہیں۔ اگر تم ......

پہلا: غنیمت ہے یہ بھی۔ قیامت کی سردی ہے

دوسرا: چائے پیئو گے؟ اُبلتی ہوئی گرم چائے پہ بالائی کی تہہ
جمی ہو تو کیسی رہے گی

پہلا: چلو اک پیالہ۔ نہیں دو سہی

دوسرا: یہاں کون زخمی ملے گا؟

(دونوں ہنستے ہیں)

پہلا: تصور کی جادوگری کوب ہے

دوسرا: ہاں خیالی پلاؤ کی خوشبو سے بھی کچھ تسلّی ہُوئی ہے

(سپاہی کے کراہنے کی آواز آتی ہے)

سپاہی: میں زندہ ہوں۔ زندہ ہوں
اس بدنفس کو مرے سامنے سے ہٹاؤ
یہ ظالم چڑیل
اپنے بازو پسارے

نامعلوم کب سے مری گھات میں ہے

میں زندہ ہوں

زندہ ہوں مجھ کو بچالو

پہلا سپاہی: سنو جیسے کوئی یہیں پاس ہی ہو

دوسرا سپاہی: تر واہمہ ہے۔ یہاں کون ہوگا

سپاہی: مرے پاس آؤ رفیقو

مرے سر پہ یہ بے حیا گدھ کی مانند منڈلا رہی ہے

پہلا سپاہی: سُنی تم نے آواز

دوسرا سپاہی: ہاں وہ........ اُدھر۔ برف میں

دفن لاشہ

پہلا سپاہی: چلو۔ بیلچہ لو۔ وہ زندہ ہے

دوسرا سپاہی: حیرت

اگر اس جگہ لاش ہوتی تو میں اتنا حیراں نہ ہوتا

مگر ایک زندہ سپاہی

یہاں معجزہ ہے

پہلا سپاہی: تو جلدی کرو۔ رات ہونے کو ہے

(دونوں سپاہی زخمی سپاہی

کے قریب آجاتے ہیں)

دوسرا سپاہی: (چھوتے ہُوئے) واقعی اس میں جاں

ہے ابھی

سنو تم میں اتنی سکت ہے

کہ اس کو اُٹھا کر ہم اپنے ٹھکانے تلک جا سکیں

پہلا سپاہی: اگرچہ تھکن سے مری ہڈیاں کڑکڑانے لگی ہیں

مگر اس سپاہی کو دستِ اجل سے بچانا مقدّم ہے

آؤ اِسے ہاتھ دیں

دوسرا سپاہی: اچھا ہُوا ہم اِدھر آ گئے

ورنہ اِس بادوباراں کے طوفاں میں زخموں سے گھائل

مجاہد کبھی بچ نہ سکتا

شہیدوں کی فہرست میں یہ بھی ہوتا

پہلا سپاہی: بس اب وقت ضائع نہ ہو

بیلچے سے تمہیں برف کی تہ ہٹاؤ

میں اتنے میں کوئی دوا دیکھتا ہوں

دوسرا سپاہی: خدا.......! ذرا اِس کے یخ جسم کو چھو

کے دیکھو

پہلا سپاہی: نامعلوم یہ اب تلک کیسے زندہ بچا ہے

موت: (اپنے آپ سے) یہ کچھ بھی کریں۔ میرے چنگل سے

اس کو نہیں چھین سکتے

یہ نخچیر میرا ہے۔ میں اس کو جانے نہ دوں گی

یہ ہمدرد

دو چار سانسوں کے ساتھی

اسے راہ میں پھینک جائیں گے یا خود بھی بھوک اور تھکن
ہی سے دم توڑ دیں گے

میں اِن تعاقب کروں گی
میں اِن تعاقب کروں گی
یہ نخچیر میرا ہے
میرا ہے
میرا ہے

(دونوں سپاہی! اِدھر اُدھر سے برف
ہٹاتے ہیں اور زخمی سپاہی کو اُٹھا کر کندھے
پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوا کا شور
اور برف باری کی شدت بڑھ جاتی ہے)

پہلا سپاہی: ذرا ہاتھ دو تاکہ میں اِس کو کندھے پہ آرام سے
ڈال لوں
سپاہی کا ہمدرد ساتھ سپاہی ہی ہوتا ہے۔ آؤ ذرا تم اِدھر سے
(زخمی سپاہی کراہتا ہے)

زخمی سپاہی: مرے ساتھیو! تم کو تکلیف ہوگی
یہ رستہ اندھیرا ہے اور پُر خطر ہے
ذرا دیکھ کر......
میرا کیا ہے کہ میں تو
فقط چند سانسوں کا مہمان ہوں......

پر تمہارے لیے زندگی کے مہ و سال کی بے کراں وادیاں ہیں

پہلا سپاہی: نہیں تم سلامت رہو گے۔ ہمارے وطن کے سپاہی
کہ اب زندگی اور محفوظ رستے پہ تم گامزن ہو چکے ہو

(چلنے لگتے ہیں)

زخمی سپاہی: مگر ظلمتوں سے سبھی راستے ڈھک چکے ہیں
یہ گھاٹی نہایت کٹھن ناک ہے
اپنی جانیں مری زندگی کے لیے مت گنواؤ

دوسرا سپاہی: یہی زندگی ہے۔ سپاہی ہمیشہ سپاہی ہی رہتا ہے
اِس کے لیے ہی کٹھن ناک رستے بنے ہیں
ہماری مسرت یہی ہے
کہ ہم تم کو زندہ سلامت۔ گجردم وہاں لے چلیں
جس جگہ اس مقدس زمینِ وطن کے زن و مرد۔
پیر و جواں
یومِ نصرت کے موقع پہ غازی سپوتوں کو
فخر و عقیدت سے دیکھیں گے
توپوں کی گونجار میں ان بہادر جوانوں پہ
تکریم کے پھول رسیں گے
جو جنگ سے سرخرو ہو کے آئے

زخمی سپاہی: مرے واسطے اس سے بڑھ کر کوئی بھی

تمنا نہیں ہے

کہ میں بھی وہاں ہوں

مگر دوستو

چند لمحے تو ستا بھی لو۔ بہت تھک چکے ہو

پہلا سپاہی: تھکن؟

تم ہماری نہ پروا کرو

ایک بے جان لاشے کو دو گام بھی کھینچنا سکت اذیت ہے

پر ایک زندہ سپاہی کو کندھوں پہ ڈالے اگر سینکڑوں میل کا

بھی سفر ہو تو کچھ بھی نہیں

دوسرا سپاہی: اور سپاہی اگر یوں تھے تو سپاہی نہیں

پہلا سپاہی: ہوائیں بہت سرد ہیں اور تمہارے ٹھٹھرتے

ہوئے ہاتھ ...... اُف کس قدر یخ زدہ ہیں

یہ دستانے لو۔ میرے ہاتھوں میں کافی حرارت ہے

زخمی سپاہی: لیکن

دوسرا سپاہی: سنو! یہ تکلف کا موقع نہیں

پہلا سپاہی: بس یہ ڈھلوان اب ختم ہونے کو ہے

اور ہم اپنی منزل کے نزدیک آ چکے ہیں

موت: یہ مخلوق کیسی ہے

اک دوسرے سے انہیں کس قدر اُنس ہے

یہ مجھے مات دے کر

"اُسے"

میرے نخچیر کو

مجھ سے چھیننے لیے جا رہے ہیں

یہ کیسے سپاہی ہیں کتنے نڈر ہیں

کہ میں تھک گئی

اور یہ جا رہے ہیں

مجھے مات دے کر

مجھے مات دے کر

مجھے مات دے کر

(موت منہ کے بل گر پڑتی ہے)

آخرِ شب
کے ہم سفر

رات کا سناٹا کہیں کہیں سے کسی چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے اور اُلّو کی آواز آجاتی ہے۔موسیقی رات کی ہیبت اور ویرانی کا منظر پیدا کرتی ہے۔ وقفوں کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ کا تاثر یوں دیا جائے جیسے کوئی فوجی پہرہ دے رہا ہو جب کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے قدموں کی چاپ ایک لحظہ کے لیے رُک جاتی ہے اور پھر جاری ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہتا ہے۔پھر اچانک دُور سے ایک نوجوان عورت کی کربناک سسکیاں اور کراہیں سنائی دینے لگتی ہیں۔فوجی بوٹوں کی چاپ رُک جاتی ہے۔ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ آندھی کی سیٹیاں سنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آواز پھر اُبھرتی ہے۔ بہت دُور سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور نوجوان عورت کی کراہیں بین کے انداز میں سنائی دیتی ہیں۔فوجی بوٹوں کی آواز رک جاتی ہے

سپاہی: یہ آواز کیسی ہے

جیسے کوئی شدّت کرب سے رو رہا ہو

مگر اس سمے؟

نصف شب ہو چکی ہے

یہاں کون ہوگا؟

یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں
اور یہ چند لاشیں
کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں
کوئی زندہ پیکر
یہان وادیٔ مرگ میں کیا کرے گا
یہ خطّہ تو کب سے ہے ویراں
یہاں کچھ شکستہ درو بام
اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں
مدّت سے یونہی کھڑے ہیں
(پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز)

نہیں یہ مرا واہمہ ہے
یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے
کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں
(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)

(دور سے رونے کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

نہیں واہمہ یہ نہیں
یقیناً کوئی رو رہا ہے
یہ آواز عورت کی ہے
جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا
سننے والے کے دل پر خراشیں لگائے

مگر اِس سمے اِس جگہ؟
کون ہوگا؟
یہ لاشیں مرے سامنے پتّھروں کی طرح سرو بے حس پڑی ہیں
یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی
اور ان کی حفاظت کو میں ہوں
فقط میں
کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے
تو پھر یہ صدا ئین کی
یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے؟
کیسی ہے؟
کیوں ہے؟
یہاں تو بجز ایک معبد
کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے
تو جیسے اِسی میں کوئی ہے
عبادت کا یہ وقت؟

(سسکی)

لیکن نہیں
یہ تو رونے کی آواز ہے
اور وہ بھی کسی اپسرا کی
چلوں جا کے دیکھوں

مگر شام تک تو
وہاں بھی
فقط چند بے نور شمعیں
شکست ظروف
اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی
آواز کوئی نہیں تھی
فقط خامشی اور اندھیرا
یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہُوئی گھنٹیاں
بے صدا ہو چکی تھیں
تو پھر اس سمے کون ہے؟
سحر ہے
یا مرا واہمہ
کیا خبر
کوئی آسیب ہو
کوئی بد روح
جو اپنے پیکر کی فرقت میں
نالہ کناں ہو
مگر میں سپاہی ہوں
اِن واہموں سے مجھے کیا تعلق
میں بُزدل نہیں

خواہ کچھ بھی ہو

میں اس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا

(پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز)

(قدموں کی چاپ اور سسکیاں اُبھرتی ہیں)

آواز نمبر۱: (ہش) سنو!

نمبر۲: جیسے کوئی ادھر آرہا ہے

نمبر۱: چلو اب اُٹھو ورنہ ہم بھی نہیں بچ سکیں گے

نمبر۲: بھلا مرنے والے کبھی آہوزاری سے زندہ ہُوئے ہیں

یہاں تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا

مگر ہم تری دُکھ بھری التجا پر یہ تابوت، پرچھائیوں کی طرح

رینگتے رینگتے اِس جگہ لے کے آئے ہیں

یہاں اب گھڑی دو گھڑی کا توقف کُھلی کودکشی ہے

یہ سارا علاقہ تو اب دشمنوں کے تسلّط میں ہے

ورنہ معبد بھی

اُٹھو چلو

(بھاری قدمون کی آواز ہر لحظہ معبد کی دہلیز کی سمت

بڑھتی چلی آرہی ہے....... سسکیاں بڑھ جاتی ہیں)

تمہیں اس جواں مرگ شوہر کے غم کی قسم اب اُٹھو

نمبر۲: چلو ہم چلیں دوسرے راستے سے نکل جائیں ورنہ........

نمبر۱: سنو پاؤں کی چاپ اِدھر ہی کو بڑھتی چلی آرہی ہے

(آوزار بڑھتی چلی آرہی ہے۔ سسکیاں
جاری ہیں۔ دونوں کرداروں کے قدموں کی
چاپ ابھر کر غائب ہو جاتی ہے۔ بھاری قدموں
کی چاپ رُک جاتی ہے)

سپاہی: کون ہے؟
(سسکیاں)
کون ہے؟
(سسکیاں)

(قدموں کی آواز قریب آکر رُک جاتی ہے)

بتا کون ہے تو؟
بتا ورنہ تیرے لیے میرے پستول کی ایک گولی بھی کافی رہے گی
(سسکیاں)

(پستول بھرنے کی آواز)

(خود کلامی کے انداز میں)
نہیں اتنی جلدی نہیں چاہیے
ذرا روشنی میں اُسے دیکھ لوں

عورت: تو رُک کیوں گئے مار ڈالو مجھے بھی، مجھے بھی،
مجھے زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے
نہ مرنے کا غم ہے
نہ جینے کی خواہش

(سسکیاں)

سپاہی: مگر تو یہاں اس سمے

ایک ویران معبد میں کیوں رو رہی ہے

تجھے یہ خبر ہے کہ اب اِس علاقے پہ دشمن کا قبضہ ہے

اور کوئی کچھ بھی نہیں جانتا

اِس کا انجاک کیا ہو

اور پھر تم تو عورت ہو

میں......اِس لیے

عورت: قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں

یہی کہنے والے ہو تم

میرے شوہر کے قاتل

مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے

یہ تابوت جو میرے خوابوں کا مدفن ہے

میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے

اس کو مرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کردے کہ یہ ظلم احسان ہوگا

سپاہی: مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل

نہ میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابوت کس کا ہے

میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سن کر ادھر آ گیا تھا

عورت: اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہوگا

کہ قاتل تو سب ایک ہیں

ایک سے ہیں

مجھے اِسے کیا

کس کے خنجر سے گھائل ہُوئی ہوں

مجھے اس سے کیا

کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھُونک ڈالا

وہ خنجر ترا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو

میں تو گھائل ہُوئی

آگ تُو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے

مرا آشیاں تو جلا

سپاہی: ہاں یہ سچ ہے

مگر نیک خاتون

یہ زندگی کا وطیرہ رہا ہے

کبھی لطف کی ساعتیں

اور کبھی ظلم کے روز و شب

اس کے نخچیر سب ہیں

تجھے کیا خبر

کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے

ہر کوئی خود کو معصوم گردانتا ہے

یہاں تک کہ قاتل بھی

اور یہ حقیقت بھی ہے
آج میں تیری نظروں میں قاتل ہوں
کیونکہ
مرا جسم مقتول کے دار سے بچ گیا
ورنہ ہم ایک سی تیغیں لے کے
اِک دوسرے کے مقابل ہُوئے تھے
اگرچہ یہ دُکھ جاں گسل ہے
مگر حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں

عورت: حوصلہ
تم تو پتّھر کے ہو اس لیے ہی یہ سب کہہ رہے ہو
تمہیں کیا خبر
میرا دل پھٹ رہا ہے
مری روح غم کے جہنم میں ڈوبی ہُوئی ہے
مری سانس نشتر کی مانند میرا جگر چیرتی ہے
تمہیں کیوں خبر ہو
تمہیں تو فقط قتل کرنا سکھایا گیا اور بس.....
زخم کی شدتوں سے تمہین کیا
جبھی تو یہ سفاک الفاظ
ہمدردیوں کی حسیں آڑ میں کہہ رہے ہو

سپاہی: تمہیں اِس کا حق ہے..... تمہیں اِسکا حق ہے

کہ تم جس کڑے درد میں مبتلا ہو
مجھے غیر جانو
مگر میری نیت کو شک کی نظر سے نہ دیکھو
مجھے تو فقط اِس قدر تم سے کہنا تھا
تم ایک کمزور عورت ہو
اور وہ بھی تباہ بے بس
یہ ویران معبد یہ جاڑے کی تریک شب
اور یہ مخدوش حالات
بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر لوٹ جاؤ
پہر دو پہر بعد اُجالے کے ہوتے ہی
میرے رفیقوں کے دستے یہاں آن پہنچیں گے
اور پھر کسے علم کیا ہو
تمہاری جوانی دکھوں کے لبادے میں بھی پُرکشش ہے
مجھے تم ریا کار سمجھو کہ غمخوار جانو
تمہیں اِس کا حق ہے
مگر صبح تک میں بھی شاید
تمہاری مدد کر نہ پاؤں
عورت: مجھے اپنے انجام کا غم نہیں
ہاں مگر اس قدر
میرے محبوب کی روح

میرے لیے آسمانوں کی پہنائیوں میں
پریشان ہوگی
اگر تم مرے دادرس ہو
تو پھر اپنے پستول کی لبلبی کو دبا کر
مجھے اس اذیت سے آزاد کردو
یہ احسان ہوگا تمہارا
مجھے صبح کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے
مجھے زندگی کے کسی بھی اجالے کی حسرت نہیں ہے
مری مانگ کی کہکشاں
بجھ چکی ہے
مجھے اب سہاروں کے جگنو
اُجالے نہ دیں گے (وقفہ)

(وقفہ کے بعد)
تو کیا تم سے اتنا بھی ممکن نہیں ہے
یہی خیر خواہی کا دعویٰ تھا
اب چُپ کھڑے سوچ میں پڑ گئے ہو
تمہارے خیالوں کی پرچھائیاں میری آنکھوں سے مخفی نہیں ہے
میں سب جانتی ہوں
جبھی تو مجھے تم سے کوئی توقع نہیں ہے
تمہیں کیا، کسی سے بھی کوئی توقع نہیں تھی

کہ دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں

اُن سے وفا کی توقُع عبث ہے

....

تو پھر میرے ہمدرد
جا اور سحر کے اُجالے کے ہوتے ہی
اپنے رفیقوں کے ہمراہ آکر
مری بے کسی کا تمسکر اُڑانا
مگر میں تجھے یہ بتادوں
کہ تم سخت مایوس ہوگے
کہ میرے بجائے
یہاں لاش ہوگی
سپاہی: نہیں یوں نہیں
میں تو یہ سوچتا ہوں
کہ اس نفرتوں کے زمانے میں
اتنی محبت
مجھے تیرے مقتول کی خوش نصیبی پہ رشک آرہا ہے
اگر کوئی میرے لیے
اس طرح نوحہ گر، مضطرب، خونفشاں ہو
تو میں زندگی موت پر وار دوں

اے وفادار خاتون!

مجھ کو تری چاہتوں نے
ترا معتقد کر دیا ہے

عورت: مری چاہتوں نے؟
مری چاہتیں
جو فقط آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہیں
فقط چند اشکوں کی لڑیاں
تو چاہت کی ضامن نہیں ہیں
مری چاہتیں
خود غرض اور بزدل ہیں

ورنہ
یہ تابوت
تنہائیوں کے کفن میں لپیٹی ہوئی
صرف اِک لاش کا گھر نہ ہوتا
کہ میں اب تلک جی رہی ہوں
مری زندگی ننگِ اُلفت ہے
اِک بدنما داغ ہے
فرقِ انسانیت پر (سسکیاں لیتی ہے)

سپاہی: محبت کی دیوی

تری یہ وفا کتنی ثابت قدم ہے
تری استقامت کے آگے اجل منفعل ہے

....

مگر زندگی کی بہاریں
ابھی اپنے دامن میں خوشبو کے جھونکے لیے ہیں
ابھی تیرے پیکر میں وہ حسن ہے
جس کی شادابیاں مدّتوں تک رہیں گی
محبت تو اک جوت ہے
روشنی ہے
ضیا ہے
جو دُکھ کے گھنیرے اندھیروں میں مرتی نہیں
اور اِسے مارنا ظلم ہے قتل ہے

عورت: ہاں مگر یہ ضیا جس دیے کے لیے تھی
وہ گم ہو چکا ہے
فقط اک دیا اس ضیا کا سزاوار تھا
اور وہ آج ویران معبد میں ٹوٹا پڑا ہے
محبت کی لو
اس کی بالیں پہ نوحہ کناں ہے

سپاہی: یہ سچ ہے
وفا نام ہے ایک پیکر سے وابستگی کا

مگر تا بکے شمعِ تربت بنی تم سلگتی رہو گی؟

ابھی کتنے زندہ جہان روشنی کی کرن کے لیے منتظر ہیں

اُٹھو اِن اندھیری گپھاؤں سے نکلو

کہ تم روشنی ہو

عورت: سپاہی!

مگر شمعِ تربت کو کس نے گھروں میں جلایا

مرے سامنے اب ساندھیورں کی دنیا ہے

اور وادیٔ مرگ کی خامشی ہے

یہاں اور کچھ دیر تک

ٹمٹماؤں گی

اور جل بجھوں گی

سپاہی: وفا کو حقیر اور ارزاں نہ سمجھو

یہ موتی بڑا قیمتی ہے

اسے خاک میں رول دینا

سراسر ستم ہے

اگر تم سمجھتی ہو یوں جاں گنوانے سے

یہ لاش پھر جی اُٹھے گی؟

تو پھر شوق سے موت کا زہر پی لو

اگر یوں نہیں تو

یہ دیوانگی...... صرف دیوانگی ہے

نہ مقصد نہ حاصل نہ منزل

اُٹھو زندگی کے کئی راستے منتظر ہیں تمہارے

عورت: مگر تم تو دشمن ہو میرے

تمہاری بلا سے

اگر میری ہستی تباہی کے غاروں میں اُترے

تمہیں کیا اگر صبحدم آنے والے سپاہی مجھے

بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں

سپاہی: میں دشمن سہی پھر بھی انسان تو ہوں

مرا دل تمہارے دکھوں سے سلگنے لگا ہے

فقط یہ نہیں ہے

کہ تم اک حسیں نوجواں اور مظلوم بیوہ ہو

بلکہ تمہاری وفا اور وابستگی نے

مرے دل کو پگھلا دیا ہے

وگرنہ مرا دل بھی پتھر کا ہو جائے گا

جب یہ منظر نظر میں نہ ہوگا

عورت: تم انساں نہیں ہو

فرشتے ہو

ورنہ ظفر مند لشکر کے وحشی سپاہی تو

مفتوح خطّے کی ہر چیز کو

نوکِ شمشیر سے تولتے ہیں
تم اُس وقت سے ایستادہ ہو
کچھ دیر کو بیٹھ جاؤ...... سپاہی

سپاہی: اور مجھے یاد آیا
کہ میں سسکیاں سن کے یہ دیکھنے کے لیے
اِس طرف آ گیا تھا
کہ اِس وقت ویران معبد سے
کیسی صدا آ رہی ہے
مگر نہ
مرے ذمّے دشمن کی لاشیں ہیں
جن کی نگہداشت کرنا ہے مجھ کو

عورت: (حیرت سے) نگہداشت!
دشمن کی لاشوں کی
وہ کیوں؟
(ذرا شگفتگی سے) تمہین اس کا ڈر ہے کہ لاشیں
کہین پھر سے زندہ نہ ہو جائیں
اور بھاگ اُٹھیں

سپاہی: (ہنستے ہُوئے) نہیں
اس سبب سے نہیں
بلکہ یہ اس لیے

تا کہ دشمن کہیں موقع پا کر انہیں لے نہ جائے

عورت: اگر لے بھی جائے تو پھر کیا؟

بھلا تم کو لاشوں سے کیا واسطہ

سپاہی: یہ سب جنگ کے بھید ہیں

تم نہیں جان سکتیں

عورت: مگر اس میں کیا بھید ہے

سپاہی: ایک تو یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو

تو دشمن کی لاشوں کے بدلے میں

اپنے شہیدوں کی لاشیں ہمیں مل سکیں

عورت: اوہ..... یہ بات ہے

سپاہی: ہاں مجھ واپس اپنی جگہ پر پہنچنا ہے

عورت: اور میں؟

سپاہی: تم!

تم یہیں چند لمحے رکو

میں ابھی لوٹ آؤں گا

اور ہاں.......

یہاں سخت سردی ہے تم کپکپانے لگی ہو

مرا کوٹ لے لو

عورت: نہیں باہر اس سے بھی بڑھ کر ہے

تم جاؤ میں تو یہیں ہوں

سپاہی: یہ لو کوٹ اور اوڑھ لو

میں سپاہی ہون اور اِن کڑے موسمون کا مرا جسم عادی رہا ہے

عورت: ذرا جلد ہی لوٹنا

(سپاہی کے قدموں کی چاپ
فیڈ ان ہو کر فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے)

(موسیقی)

(سپاہی کے قدموں کی چاپ فیڈ ان ہوتی ہے
اور مائک کے قیرب آ کر رُک جاتی ہے)

سپاہی: (گھبرائی ہُوئی آواز میں) غضب ہو گیا

عورت: کیا ہُوا دوست

سپاہی: اِک لاش کم ہے

عورت: تو پھر کیا ہُوا

سپاہی: اُف غضب ہو گیا تم نہیں جان سکتیں
کہ یہ بات کتنی خطرناک ہے

عورت: کس طرح

سپاہی: میری غفلت کے باعث یہ سب کچھ ہُوا
اور اب
اس کی پاداش مجھ کو بھگتنا پڑے گی

عورت: تو پھر

سپاہی: میں نہیں جانتا اِس کا انجام کیا ہو

کہ یہ مجرمانہ تغافل ہے
اور خاص کر حالتِ جنگ میں
اس کی پاداش
بس موت ہے

عورت: تو میں اس کا باعث بنی ہوں
مرے واسطے ہی تو تم
فرض کو بھول بیٹھے تھے
اور اب

سپاہی: میں جاتا ہوں
جو کچھ بھی ہو صبح تک میں وہیں پر رہوں گا
کہیں باقی لاشیں بھی غائب.......

عورت: سُنو
تم نے میرے لیے یہ کیا
اور اب ایک صورت میں

تم......... میرے شوہر کی یہ لاش
باقی کی لاشوں میں رکھ دو

سپاہی: یہ کیا کہہ رہی ہو
مجھے اپنے کانوں پہ شک ہے

عورت: سپاہی

یہی ایک صورت ہے

اوراب تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں

چلومل کے یہ لاش ہم لے چلیں

سپاہی: لیکن اتنا کرم!

عورت: کچھ نہیں تم چلو..........

وقت کم ہے

چلو..........

(موسیقی)
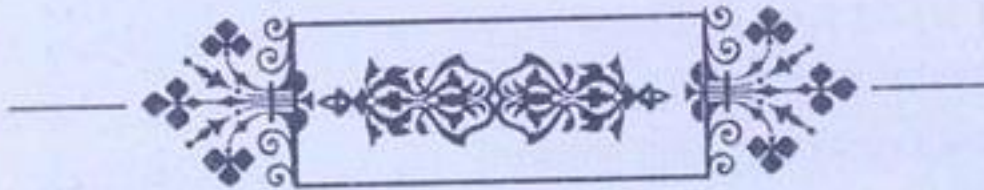
عبدالقوی ضیا

سڈبری

احمد فراز کینیڈا میں

یوں تو اب تک اردو کے بیشتر نامور اور ممتاز شعراء اور کینیڈا تشریف لا چکے ہیں مگر یہ سعادت ابھی تک صرف احمد فراز کو نصیب ہوئی ہے کہ ان کا ایک مجموعہ کلام ''نابینا شہر میں آئینہ'' کینیڈا کے ایک شہر مانٹریال سے فراز کے پرستاروں اور اردو کے شیدائیوں کی کوششوں کی بناء پر شائع ہوا ہے۔

یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء میں مانٹریال کی ادبی اور ثقافتی انجمنوں نے مل کر شائع کیا اور اس کی اشاعت کی بات چیت فراز صاحب سے ۱۹۸۲ء میں ہی ہو چکی تھی جب وہ پہلی بار کینیڈا تشریف لائے اور اسی موقع پر مجھے ان سے کھل کر ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت وہ اردو سوسائٹی ٹورنٹو جس کے سربراہ جناب حفظ الکبیر قریشی تھے ان کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ پہلی کینیڈین اردو کانفرنس گریجویٹ سنٹر جنوبی ایشاء اسٹڈیز۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو ڈائریکیٹ ملٹی کلچرل ازم سیکریٹری آف اسٹیٹ حکومت کینیڈا اور انجمن اردو کینیڈا کی مشترکہ کوششوں کی وجہ سے منعقد

ہو رہی

To the sene with frency of political statements and quickly went on to win the hearts and minds of the people. A native oa Kohat, he brought a new and unique stylemcharacter and content tw his personalized and romantic poetry....... an artist with a feel for the common man, he has touched the pulse of his nation by highlighting social problems.

جو لوگ احمد فراز سے ملنے کے لئے بے چین اور ان کے لئے چشم براہ تھے۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ ان کو پڑھا تھا۔ ان کا کلام کبھی مہدی حسن کی زبانی یا کبھی ٹیپس Tapes کے ذریعے سنا مگر ابھی تک ان کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اردو سوسائٹی اور اس کی جانب سے معقد کی ہوئی

کانفرنس کی بدولت نہ جانے کتنے لوگوں کو یہ سنہری موقع نصیب ہو رہا تھا۔ کہ وہ احمد فراز کو دیکھ لیں یا ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر لیں۔

احمد فراز سے ملنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف ایک ممتاز ادیب اور منفرد قسم کے شاعر ہیں بلکہ ایک کیف زا۔ پُر بہار اور شائستہ فطرت کے انسان بھی ہیں۔ خوش گفتار ہیں۔ خوش مزاج ہیں ان کی شخصیت سحر انگیز بھی ہے۔ مسحور کن بھی بڑا پیارا سا معصوم قسم کا تبسم ہمیشہ ان کے ہونٹوں پہ کھلا کرتا ہے۔ باتیں کرتے ہیں تو ایسی دلچسپی اور دلفریبی کے ساتھ کہ سننے والا ہمہ تن گوش ہو جائے۔ لطیفے سناتے ہیں تو بے ساختہ ہنسی نکل جاتی ہے ایک ادبی نشست میں ایک خاتون شاعرہ موجود تھیں جو کسی Laboratory میں کام کرتی ہیں۔ نصیحت کرنے لگے'' Lab کو Lab سمجھ مسئلہ دل نہ بنا'' اور لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی طرح ایک اور محفل میں کچھ شاعر چوری چھپے سہم سہم کر نارنگی کے رس میں رخت زر ملا کر جی بہلا رہے تھے بولے یہ کیا بد دیانتی اور کس قسم Pseudo پینے والے ہو اگر کھل کر نہیں پی سکتے تو انگور کی بیٹی کی عصمت دری تو اسطرح نہ کرو۔ شاعر جھینپ کر رہ گئے۔

کسی اور موقع پر ایک خاتون اپنا مقالہ غالب کی شاعری کے تعلق سے پیش کر رہی تھیں تلفظ اس قدر غلط تھا کہ احمد فراز کو بار بار ٹوک کر صحت کرنا پڑتی تھی۔ مگر ان خاتون پر کوئی اثر نہیں ہوا مجبور ہو کر کہنے لگے کہ سامعین حضرات غالب کیلئے دعائے خیر کریں۔ حق مغفرت کر بڑے آزاد مرد تھا۔ ٹورنٹو میں ایک ادبی اجتماع کے موقع پر فرمایا کہ اس شہر میں اتنی بار آچکا ہوں کہ اب خود کو مقامی شاعر سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ جب شام فراز منائی گئی تو بولے کہ کینیڈا آنے کا اتفاق اتنی دفعہ ہو چکا ہے کہ جس طرح وطن سے نکل کر اکثر وطن والوں کی یاد آتی ہے یہاں سے واپس جا کر کینیڈا والوں کی یاد ستاتی

ہے۔ سننے والے ایسی محبتانہ سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

احمد فراز صرف بے تکلف قسم کے آدمی نہیں ہیں بلکہ انتہائی لا ابالی اور غیر منظم طرز کے انسان بھی ہیں۔ جب ''نابینا شہر میں آئینہ'' چھپ کر منصہء شہود پر آئی تو اس کی رونمائی کے لئے آ گئے کہ برٹش Subject ہیں مگر امریکہ کا ویزا حاصل کرنا بھول گئے۔ مانٹریال میں اس کتاب کی رسم اجراء اور ایک عظیم الشان مشاعرے اور مختلف النوع تقریبات کے بعد اس کی رونمائی امریکہ کے شہر واشنگٹن ڈی سی میں ہوئی اور پھر دوسرے اور شہروں میں بھی ہونا تھی۔ لہٰذا وہ امریکی قونصل جنرل کے دفتر ویزا حاصل کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے امریکی افسر کا سوال تھا کہ ''آپ امریکہ کیوں جانا چاہتے ہیں'' جواب آسان تھا ''مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے'' جو میرے ہی اعزاز میں منعقد ہو رہے ''مشاعرہ چیست'' دوسرا معصوم سا سوال۔ poetry recitation session مختصر سا جواب تھا۔ تو آپ کو شعر پڑھنے کا معاوضہ بھی ملے گا۔ ''شاید'' اور کیا ''مصروفیات ہوں گی'' ایک اور سوال تھا۔ ''میری کتاب کی Ceremony launching بھی ہونا ہے۔'' اوہو۔ پھر تو یہ Visit ادبی سے زیادہ تجارتی ہوگئی۔ آپ کو انکم ٹیکس ادا کرنا ہوگا کتاب سے جو منفعت ہوگی اس کا حساب دینا ہوگا۔ یہ سن کر فراز چکرا گئے۔ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ لہٰذا ویزا نا منظور ہو گیا۔ اب بڑی دشواری تھی۔ واشنگٹن میں ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ٹکٹ فروخت ہو چکے تھے۔ پبلسٹی خوب ہو چکی تھی۔ ہال اور PA System بک ہو چکا تھا۔ اور سونے پر سہاگا یہ کہ لوگ بے انتہا مشتاق تھے۔ ''نابینا شہر میں آئینہ'' کے خالق سے ملنے کے لئے۔ خود فراز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کون سی صورت کینیڈا سے امریکہ جانے کی نکالیں۔ علی عباس حسنی جو اس وقت پاکستان کیو بیگ ایویشن کے صدر اور فراز کے میزبان تھے۔ ان کو دلاسہ دینے لگے اور کہا کہ آپ

گھبرائیے نہیں ہم کسی نہ کسی طرح آپ کو امریکہ پہنچا کر رہیں گے۔

حقی صاحب کے بیٹے شان کے پاس ہوائی جہاز اڑانے کا لائیسنس ہے اور وہ ایرو کلب کے ممبر بھی ہیں۔ ایک چھوٹے سے Seaters 4 جہاز کا انتظام کیا گیا اور رات کی تاریکی میں شاہین احمد فراز اور حسنی صاحب کو اس میں بیٹھا کر کینیڈا کی سرحد پار کر کے امریکہ کی حدود میں داخل ہو گئے اور جب جہاز زمین پر اترنے لگا فراز کو یاد آیا کہ وہ اپنا پاسپورٹ تو حسنی کی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی بھول آئے ہیں۔ اترنے کی اجازت جہاز کو مل چکی تھی مگر ایسی صورت حال میں وہ اترتے اترتے ایک جھٹکے کے ساتھ پھر اوپر کی جانب پرواز کرنے لگا اور سی کلب کے Runway پر پہنچا جہاں کار کو چھوڑ دیا گیا۔

پاسپورٹ لے کر یہ جہاز پھر اڑا اور آخر کار فراز کو امریکہ کی سرحد میں پہنچا ہی دیا اور اس کے بعد کن کن دشواریوں کے ساتھ واشنگٹن ڈی سی تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا یہ اپنی جگہ خود ایک طویل داستان ہے۔ بہر حال امریکہ کے مختلف شہروں میں ان کے اعزاز میں مشاعرے بھی ہوئے۔ کتاب کی رونمائی بھی ہوئی۔ ادبی جلسے بھی منعقد ہوئے اور کافی دن وہاں قیام کر کے کینیڈا واپس آئے اور پھر برطانیہ چلے گئے۔

احمد فراز جب کینیڈا تشریف لائے تو اس سے بہت قبل ان کی شہرت کا سکہ تمام عالم اردو ادب پر بڑی مضبوطی سے جم چکا تھا۔ ان کے کئی دیوان شائع ہو چکے تھے مہدی حسن اور دوسرے موسیقار ان کی کتنی ہی غزلیں اور مختصر نظمیں گا چکے تھے۔

حکومت کے معتوب ہونے کی وجہ سے ان کو کتنی مصیبتوں کو جھیلنا پڑا تھا اس کے چرچے بھی اس ملک میں عام تھے۔ ان کا تخلیقی عمل جس کا بہت قریبی رشتہ اس دور کے افکار اور اقدار سے ہے کن

حدود سے گزر کر کس منزل تک آ پہنچا تھا، اس کا بھی اندازہ یہاں کے محبان اردو کو افراط اور تفریط کے ساتھ تھا۔ پہلی بار جب وہ تشریف لائے تو اس وقت فیض اور سردار جعفری جیسے مستند اور معتبر شعراء بھی آئے ہوئے تھے۔ جمیل الدین عالی اور گوپی چند نارنگ بھی سرگرم محفل تھے۔ پھر بھی احمد فراز کی جو پذیرائی ہوئی اور جس عنوان ان کی دھاک کینیڈا کیا پورے شمالی امریکہ پر بیٹھی اس کا اندازہ نہ صرف ہم سب کو بلکہ فراز صاحب کو بھی بخوبی ہے۔ ان کی نظم ''محاصرہ'' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی بند لوگوں کو ازبر ہو گئے۔

مشاعرے کے دوسرے دن جس سے بات کر احمد فراز کا نام اس کی زبان پر تھا۔ اور یوں یہ شاعر اپنی پہلی ہی آمد پر لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا اور Over Night وہ کینیڈا کا مقبول ترین شاعر بن گیا۔

ٹورنٹو کے بعد مانٹریال میں جو مشاعرہ ہوا اس میں ایک نازک صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ اس موقع پر اس وقت کے سفیر پاکستان بھی موجود تھے اور جب فراز نے ان کی موجودگی میں وہ تمام نظمیں سنائیں جن میں ملک کی زبوں حالی۔ مسموم سیاسی فضا۔ غیر صحتمند حالات اور آمرانہ طرز حکومت کا بھرپور جائزہ لیا گیا تھا تو یہ بات سفیر صاحب کو ذرا ناگوار گزری وہ کچھ کر تو نہیں سکتے تھے کہ مجمع اسی قسم کے کلام کے سننے کا مشتاق تھا بس اٹھ کر چلے گئے اور فراز اسی نوعیت کی نظمیں بے دھڑک سناتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ کینیڈا والوں نے ان کا ایک شعری مجموعہ اس ملک سے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اردو سوسائٹی ٹورنٹو جو ایک عرصہ تک اردو کی نشوونما اور ترویج کے لئے بڑھ چڑھ کے کام کر رہی تھی اور ایک فعال ادارے کی حیثیت رکھتی تھی اس نے نومبر ۱۹۸۳ء میں ایک اور ادبی کانفرنس کے

انعقاد کا اعلان کیا جس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے قبلہ مجروح سلطان پوری اور ڈاکٹر بشیر بدر تشریف لائے تھے اور پاکستان سے احمد فراز مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہو رہے تھے۔امریکہ سے ڈاکٹر منیب الرحمٰن ڈاکٹر فرانسیس پرلیشچٹ پروفیسر چودھری محمد نعیم اور ڈاکٹر عمر میمن مدعو تھے۔یہ کانفرنس بھی اسی مقام پر منعقد ہوئی جہاں اس سے قبل دو ایک اور ادبی مجلیس منعقد ہو چکی تھیں۔مقالے پیش کرنے والوں پر ڈاکٹر پریشچٹ ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر منیب الرحمٰن وغیرہ نمایاں حضرات میں سے تھے صدارت کے فرائض مجروح سلطان پوری اور احمد فراز نے انجام دیئے۔

شام کو جو محفل مشاعرہ منعقد ہوئی اور جسکی صدارت جناب مجروح سلطان پوری نے فرمائی اس میں جب احمد فراز پڑھنے کے لئے تشریف لائے تو سامعین میں سے کسی صاحب نے آواز لگائی کہ جناب فراز صاحب آپ پاکستان کے خلاف کوئی نظم نہیں پڑھیں گے۔فراز کا جواب سادہ بھی تھا اور معصوم بھی انہوں نے فرمایا کہ میری آواز میری آزادرائے میری آزادی فکر و تخیل پر کوئی پہرے نہیں بٹھا سکتا میری جرأتِ اظہار نے انسانوں کے ضمیر و فکر کو زندگی بخشی ہے اور انہیں بولنے کے سلسلے میں جرأتِ رندانہ عطا کی ہے۔یہ کہہ کر انہوں نے وہ ساری نظمیں سنائیں جن کے سننے کے لئے مجمع مشتاق تھا اور جب تھک گئے تو مئیکروفون سے ہٹ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

کینیڈا میں اردو کی بقا اس کی ترقی کے لئے ایک اور مناسب اور مضبوط قدم جناب اشفاق حسین نے اٹھایا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۳ء کے دن جو پاکستان کا یوم جمہوریہ بھی تھا ایک اور ادارے کی بنیاد رکھی اور اس کا نام Writer Forum of Pakistani Canadians رکھا گیا اور اشفاق حسین اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

اشفاق کا نام اردو داں طبقہ کے لئے اجنبی نہیں تھا ان کے کینیڈا آنے سے قبل ان کا ایک مجموعہ

کلام ''اعتبار'' کے عنوان سے چھپ چکا تھا اور ان کی ایم اے کی تھیسس بھی فیض ایک مطالعہ کے عنوان سے شہرت پا چکی تھی یہ انھیں کا کرشمہ تھا کہ رسالہ اردو انٹرنیشنل کے نام سے نکالا Writers Forum ستمبر ۱۹۳۸ ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس An Assessment of Creative Urdu Literature in Canada and Pakistan کے عنوان سے منعقد کر چکے تھے جس میں شرکت کرنے کے لئے شان الحق حقی ڈاکٹر جگنناتھ آزاد رئیس امروہوی صہبا لکھنوی کشور ناہید محمد علی صدیقی اور افتخار عارف وغیرہ تشریف لا چکے تھے اور جس کی نثری نشست میں راقم الحروف نے اپنا مقالہ "Revolution of Urdu" Literature in "Canada" جو ادباء اور شعرائے کرام اردو سوسائٹی کی جانب سے دوسرے ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے ان کے اعزاز میں مختلف النوع تقاریب، جلسے اور نشستیں منعقد ہوتی رہیں مگر ایک قابل ذکر محفل اشفاق حسین کی کوششوں کا نتیجہ شام فراز کے نام سے منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب مجروح سلطان پوری نے کی اور جس میں فراز صاحب کی کتاب ''نابینا شہر میں آئینہ'' کی رونمائی بھی ہوئی۔ یہ شام بڑی دیر تک جاری رہی اور لوگوں نے جی بھر کے احمد فراز اور مجروح صاحبان کو سنا اور ان حضرات نے مقامی شعراء کا کلام سماعت فرمایا ''نابینا شہر میں آئینہ'' اب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

کینیڈا کے مغربی علاقے کے شہر کیلگری میں جہاں اقبال حیدر نے جوش لٹریری کے بعد مانٹریال میں جو مشاعرہ ہوا اس میں ایک نازک صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ اس موقع پر اس وقت کے سفیر پاکستان بھی موجود تھے اور جب فراز نے ان کی سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور اس طرح شمع اردو کو اس ملک کے مغربی نواح میں فروزاں کا سامان بہم کیا تھا ایک سمپوزیم جوش اس صدی کا عظیم

شاعر اور اس کے ساتھ ایک مشاعرہ کے قیام کا بھی اعلان کیا۔ اس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے ڈاکٹر محمد حسین روس سے ڈاکٹر قمر رئیس پاکستان سے محترم رئیس امروہوی رضا ھمدانی وغیرہ ہم مدعو کئے گئے تھے۔ کینیڈا سے راقم حروف نے ایک مقالہ ''جوش ایک منفرد شخصیت اور شاعر'' کے عنوان سے پڑھا مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے کینیڈا سے جناب جمال زبیری جوش مندو زائی اور کلثوم اعجاز بھی مدعو تھیں، کیلگری کی تقریبات کے بعد رائٹرز فورم آف پاکستان کینیڈین نے جس کی بنیاد اردو کے معروف شاعر اور اردو انٹرنیشنل کے مدیر اشفاق حسین کے ہاتھوں پڑ چکی تھی جوش لٹریری سوسائٹی سے رابطہ قائم کر کے ایک جج سمپوزیم کا اعلان کر دیا تاکہ وہ شاعر جو کینیڈا کئی بار آچکا تھا اور جس کی عظمت کا سکہ تمام عالم اردو ادب پر بیٹھا ہوا تھا اس کو خراج عقیدت اس کی موت کے ایک سال کے بعد پیش کر دیا جائے ایک طرف کیلگری سے شعراء اور ادباء کا کارواں ٹورنٹو پہنچا دوسری طرف رائٹرز فورم والوں نے احمد راز اختر الایمان زہرہ نگاہ، ڈاکٹر شارب ردولوی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ کو فیض سمپوزیم میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کر رکھا تھا۔

یہ مجلس دو حصوں پر منقسم تھی پہلے شام کو مشاعرہ تھا جس کی صدارت اختر الایمان نے کی۔ رئیس امروہوی اور ڈاکٹر محمد حسن مہمان خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ مجمع زہرہ نگاہ اور احمد فراز کا کلام سننے کو بے چین تھا لوگوں کا تقاضہ تھا کہ زہرہ نگاہ ترنم سے اپنا کلام سنائیں مگر انہوں نے چند غزلیں اپنی سریلی آواز میں سنا کر مختصر نظمیں اور دوسری کئی غزلیں تحت الفظ سنائیں اور سامعین سے کہا کہ آپ یقین مانئے میں تحت الفظ بھی اتنا ہی اچھا پڑھتی ہوں جتنا کہ ترنم سے ''شاعروں کی دونوں نشستوں میں حسب معمول احمد فراز بہت مقبول ہوئے اور ان کی دو نظمیں جو لوگ کئی بار ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں سن چکے تھے پھر سنیں اور بڑے اشتیاق سے سنیں زہرہ نگاہ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شاعر

اس محفل میں کامیاب رہا تو احمد فراز تھا۔

دوسرے دن رائل پارک ہوٹل کے مرصع ہال میں فیض سمپوزیم کے تعلق سے مقالوں کا سیشن تھا جس میں باہر سے آئے ہوئے تمام ہی دانشوروں کے مضامین تھے کینیڈا کے لکھنے والوں میں سے صرف میں نے ایک مضمون "Faiz and His Symbolism" پڑھا پہلے سید خورشید عالم جو فورم کے جنرل سکریٹری تھے انھوں نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور سب کا خیر مقدم کیا اس کے بعد کرنل انوار احمد نے فورم کے اغراض و مقاصد بیان کئے پھر پہلی نشست کی صدارت کے لئے احمد فراز کا نام پکارا گیا اور وہ مسند صدارت پر آ بیٹھے اور فرمانے لگے کہ یہ بھی حالات کی ستم ظریفی ہے کہ دو سال پہلے جب میری کتاب کا اجراء لندن میں ہوا تھا تو اس جلسے کی صدارت فیض صاب نے فرمائی تھی اور آج جب کہ ان کی ایک سالہ برسی منائی جا رہی ہے تو اس نثری نشست کی صدارت میں کر رہا ہوں اس کے بعد انہوں نے بڑے پیارے انداز میں اپنے روابط کا سلسلہ جو فیض صاحب سے قائم تھا اور کس طرح وہ دونوں فکر و خیال کی آزادی کی تحریک میں ہم سفر رہے ہیں اور اپنی نگارشات اور تخلیقات سے اظہار خیال اور گفتار کی آزادی کا جذبہ جوان دونوں نے بہت سے لکھنے والوں میں پیدا کیا اس کا ذکر کیا۔

اس مذاکرہ کے بعد کتنی ہی نجی محفلیں منعقد ہوتی رہیں جن میں مہمان کئی ایسے مواقع آئے جب شعراء اور ادباء شریک تھے البتہ رئیس امروہوی اختر الایمان اور ڈاکٹر محمد حسن شکاگو اور پھر امریکہ کے دوسرے شہروں کو تشریف لے گئے جہاں ان کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی گئیں تھیں۔

احمد فراز کی شاعری بڑی حد تک فطری تقاضوں، آسودگی کی خلش نارسائی کا احساس اور حق گوئی کی فضا لئے ہوئے ہے وہ کسی پر جبر و ستم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ منگی رجحانات کی بیخ کنی

پر لگے رہتے ہیں جو لوگ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں ان کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

بعض افراد یا جماعتوں کو ان کی اعانت کی ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے وہ جو کچھ کر سکتے تھے کرنے سے انکار نہیں کیا ادیبوں کے اجتماعی مسائل ان کی معاشی بدحالی کا بھی انہیں پوری طرح اندازہ ہے ان کو یہ بات بھی گراں گزرتی ہے کہ شعراء و ادباء ایوان صدر میں صاحب کی دعوت کھانے پہنچ جاتے ہیں اور جب وہ صدر یہ اعلان کرتا ہے کہ یاد رکھیے آپ حضرات نے میرا نمک کھایا ہے لہٰذا نمک حرامی نہیں کرینگے۔ تو ادیب اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے اور نہ عملی طور پر اپنے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں وہ ہمیشہ ایسی مہتم بالشان دعوتوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ یہ اطوار ایک باقار ادیب اور شاعر کے نہیں ہوتے ضمیر فروشی ان کی عادت نہیں، گندم نما جو فروشی ان کی خصلت نہیں ادیب و شاعر اپنی معاشی بدحالی کے باوجود اپنا ایک مقام رکھتا ہے وہ اسی کلیہ کے قائل ہیں۔ وہ دل میں کوئی بات دبا کر نہیں رکھتے جو دل میں وہی زبان پر منہ پھٹ ہیں مگر دل دکھانے والی باتیں نہیں کرتے وسیع النظرفی ان کی جبلت کا خاصہ ہے۔

ہمارا ملک گذشتہ تین دہائیوں میں جس فکری سیاسی معاشی اور معاشرتی بدحالی کا شکار رہا ہے احمد فراز کی شاعری اس کی پوری طرح آئینہ دار ہے ان کی متعدد نظمیں ان حالات کا بھرپور احاطہ کئے ہوئے ہیں مگر انکا کلام ان حالات پر بے معنی تنقید یا بے جا کیچڑ نہیں اچھالتا ہے صرف ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ شعور کی بیداری نظریات کی صحت مندی کے لئے لکھنا وہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ملک سے دور یورپ اور شمالی امریکہ میں بالعموم اور کینیڈا میں بلخصوص اپنی حق گوئی اور انسان دوستی کے لئے مقبول ہیں اور اس مقبولیت کا احساس فراز کو بھی اتنی ہی شدت سے ہے کہ کبھی وہ خود یہ

سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ کینیڈین تو نہیں ہیں۔

کمیٹی آف پروگریسو پاکستانی کینیڈین نے ایک مخصوص محفل سجائی۔ اس کا نام شام فراز تجویز کیا گیا اور ۲۵ اکتوبر کی شام کو ایک آراستہ پیراستہ ہال میں اس کا اہتمام ہوا اس میں داخلہ کا مخصوص تھا مگر شائقین فراز خاصی تعداد میں وہاں پہنچ گئے۔ یاراں نکتہ داں کے لئے یہ صلائے عام تھی۔ شام فراز میں تین مقالے جن میں بڑے بھرپور مگر محبتانہ انداز میں فراز کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ اشفاق حسین نے جو اس محفل کے بھی حسب معمول ناظم تھے بعنوان ''شہر فراز اور اس کے کرداروں کا المیہ'' پڑھا اور اس میں فراز کے ہاں جو شہر استعاراتی اور علامتی انداز میں جگہ بہ جگہ نظر آیا ہے اور جس میں شہر کے در د بام کوچہ و بازار راستے اور شاہراہیں منبر و مسجد محلات اور عمارات ہی سب گوناگوں انداز میں ابھرتے ہیں بلکہ ان میں بسنے والے انسانوں کی زبوں حالی پس ماندگی ان کے مسائل اور مصائب کا ذکر بھی خوبصورتی سے آتا ہے پیش کیا۔ دوسرا مقالہ جناب ڈاکٹر سہیل نے پڑھا جس کا عنوان تھا ''شہر آشوب کا تنہا مسافر'' اور اس میں استعاروں اور علامتوں سے ہٹ کر فراز کا گزر کس شہر آشوب سے ہوتا ہے اس کا تجزیہ تھا ان کے نزدیک احمد فراز جب شہر آشوب میں داخل ہوا تو شدید تنہائی کا احساس تھا اس شہر کا مقدر ظلم تھا اس شہر کا زینہ افراتفری پر مبنی تھا یہی تو سبب ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زندان جاناں

ان دونوں مقالوں میں اس شہر کرب کی نشاندہی کی گئی تھی جو احمد فراز کی پہچان بھی ہے اور اس کا المیہ بھی اور اس کا اظہار اس کے مجموعہ ''بے آواز گلی کوچوں میں'' اور اس کے بعد ''نابینا شہر میں آئینہ''

بطور خاص آتا ہے اور ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان المیوں کا زخم ابھی بھرا نہیں ہے بلکہ اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔

ان حضرات کے بعد سید خورشید عالم جو معروف نقاد ہیں اور جن کی کتاب ''تنقید اور ترجیحات'' کچھ عرصہ ہوا شائع ہوئی اور دوسری کئی کتابیں زیر طبع ہیں ایک مقالہ ''احمد فراز شخصیت اور فن کا جدلیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے پڑھا اس مضمون میں احمد فراز کی تیس سالہ شعور کی پرواز اور آگہی کی بلندی کا جائزہ بڑے سلیقہ سے لیا گیا تھا ہمارے افق ادب پر پچھلے چالیس سال سے فیض احمد فیض کے علاوہ دوسرے شاعروں کے ساتھ احمد فراز بھی ابھر کر سامنے آئے ان کی آواز مدھم سروں میں ہم سب کے کانوں میں گونجی اور ان کی شاعری نے جس عنوان ہماری سماجی اقدار تاریخی جبریت اور خارجی حالات کا تجزیہ کیا وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکا ادب میں شعر میں معاشرے میں سب قدریں پامال ہوسکتی ہیں مگر انقلابی اقدار ہزیمت خوردہ نہیں ہوسکتیں۔ احمد فراز کی شاعری خورشید عالم کے نزدیک اس کا منبع مخرج ہے یہ محفل دو حصوں پر منقسم تھی پہلی نشست پر اشفاق حسین نے صاحب محفل کا تعارف کرایا تھا اور اس شام کو محصورین مجاہدین اور ظلم وستم کے مارے ہوئے کے نام معنون کیا تھا جو احمد فراز کی شاعری کے اصل کردار ہیں احمد فراز نے اپنا کلام سنانے سے پہلے اس شام کو اپنے نام سے منسوب ہونے کے بجائے فیض مرحوم کے نام معنون کیا کہ انہوں نے سب سے پہلے امریت کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے قلم کو ظلم وتشدد سے بزدآزما ہونے کے لئے استعمال کیا۔ فراز نے کئی نظمیں سنائیں اور پھر چند غزلیں بھی پڑھیں دوسرے حصے میں ڈاکٹر خالد سہیل اور خورشید عالم کے مضامین تھے اور پھر احمد فراز کا کلام اتنی طویل مگر اتنی پرلطف شام اتنی جلد ختم ہوگئی کہ اشفاق کو یہ کہنا پڑے گا کہ محصورین کے نام یہ شام پلک جھپکاتے ہی ایک لمحہ میں تبدیل ہوگئی۔ اس محفل میں لوگوں

نے احمد فراز کو کئی رخ سے دیکھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے، ایک Committed فرد کی حیثیت سے آمرانہ اور جبری طاقتوں سے مقابلہ کرنے والے ایک مرد آزاد کی حیثیت سے بھی بلاشبہ وہ ایک مسرور کن شام جس کا

احمد فراز ۱۹۸۸ء میں پھر کینیڈا تشریف لائے یہ وہ موقع تھا جب رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈین اور ایسوسیایشن آف پاکستانی میڈیا (کیمپ) نے مل کر ڈاکٹر محمد اقبال کی ۵۰ سالہ برسی منانے کا ارادہ کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ادارہ عارضی طور پر اقبال یادگار کمیٹی کے نام سے قائم کیا جس کے Coordinator جناب اشفاق حسین چنے گئے۔ یہ پروگرام لگ بھگ دو ہفتوں پر مشتمل تھا اور پہلا جلسہ ۸ جولائی ۱۹۸۸ء کی شام کو استقبالیہ کی شکل میں شیزان ہوٹل میں منعقد ہوا جس Nostacgia یا سرور آج بھی شرکاء کے نام ذہن میں باقی ہے۔ اس کے مہمان خصوصی علی سردار جعفری تھے اس محفل میں اشفاق حسین نے یہ اعلان کیا کہ جمعرات (۱۴ جولائی) کو ان تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے احمد فراز بھی تشریف لا رہے ہیں لوگوں کے چہرے مسرت و انبساط سے چمکنے لگے۔

دوسرے دن اقبال کے تعلق سے ایک محفل مذاکرہ تھی جس میں تقاریر بھی ہونا تھیں اور مقالے بھی پیش کئے جانے والے تھے۔ پہلی نشست کی صدارت احمد فراز نے کی اور اس اجلاس میں ڈاکٹر شارب ردولوی نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں اقبال پر میر انیس نے ڈاکٹر اقبال کا ذکر ہندوستان میں کس کس عنوان ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا اس کا احاطہ اپنے ایک مضمون میں کیا مگر انھوں نے اس مضمون کا خلاصہ بصورت تقریر پیش کیا۔ اس سیشن میں مبصر کی حیثیت علی سردار جعفری کی تھی جنھوں نے ڈاکٹر قمر رئیس کی بات کو اور بھی آگے بڑھایا اور اقبالیات کے چرچے کس عنوان ہندوستان میں

ہو رہے ہیں ان کا ذکر کیا بعد میں حاحب صدر احمد فراز نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور فاضل مقررین نے جو کچھ کہا تھا اس کے بارے میں نقد و نظر کا اظہار کیا۔

دوسری نشست میں صدارت علی سردار جعفری کی تھی اور مقالہ پڑھنے والوں میں احمد فراز اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ بہر صورت یہ مذاکرہ بہت کامیاب رہا۔

اس کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد بہت سی نجی محفلیں منعقد ہوئیں جن میں ہندوستان اور پاکستان سے آئے ہوئے ادباء اور شعراء کا نہ صرف کلام سنا گیا بلکہ ان سے کھل کر بات چیت بھی ہوئی۔ انٹرویو بھی لئے گئے ضیافتیں بھی ہوئی۔ خاطر مداراتیں بھی۔ ان کا ذکر مضمون کو طوالت سے بچانے کے لئے حذف کرتا ہوں۔

بزم اور ادب مانٹریال نے ۱۱۔۸۲ مئی ۱۹۹۰ ایک غالب سمپوزیم منانے کا اعلان کیا۔ شرکاء میں ڈاکٹر محمد حسن ڈاکٹر فالف رسل (یہ دونوں حضرات اپنی مصروفیات کی بنا پر آنہ سکے) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ہندوستان سے حمایت علی شاعر اور نکہت بریلوی پاکستان سیشاہد ملک اور عبید صدیقی برطانیہ سے تشریف لائے۔ ایسے نادر موقع پر احمد فراز نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا چنانچہ وہ بطور خاص مدعو تھے اور پاکستان کی عظمت کو اس موقع پر دوبالا کر رہے تھے۔ یہ سمپوزیم کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا اجلاس اختتامیہ جس میں وزارت ملٹی کلچرلزم Multiculturalism کے نمائندے بھی شریک تھے۔ پھر شام غزل اور دوسرے دن ایک ادبی کانفرنس کا اجلاس تھا۔ پہلے پہلی نشست کی صدارت راقم الحروف نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ڈاکٹر خالد سہیل ڈاکٹر ساجدہ علوی وغیرہ تھے۔ مصرین میں جناب احمد فراز ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر داؤد رہبر شامل تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ملک زادہ صاحب نے کی مقالہ پیش کرنے والوں میں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ داؤد رہبر اور شاہد ملک صاحبان تھے۔ یہ دونوں سیشن کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے ان کے بارے میں تفصیل قارئین کے لئے گرانی کا سبب بن سکتی ہے لہٰذا آگے بڑھتا ہوں رات کو محفل مشاعرہ جمی۔ جس کی نظامات ملک زادہ نے فرمائی اور صدارت احمد فراز نے۔ اور اس محفل میں احمد فراز نے ایک بار پھر بڑے شدومد اور لگن کے ساتھ اپنی خوبصورت نظمیں اور تازہ غزلیں سنائیں۔ حسن اتفاق کہ اس محفل میں بھی سفیر پاکستان جناب ماجد خیری صاحب موجود تھے۔

اس کے بعد احمد فراز امریکہ چلے آئے جہاں ان سے میری ملاقات ۲ جون کے مشاعرے میں ہوئی جو حلقہ فن و ادب خیبر سوسائٹی اور پاکستان ایسوسی ایشن نے مل کر Roonruelt Hotel نیویارک ہو گیا تھا۔

خوش قسمت کہ اس مشاعرے میں ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے تین حضرات جناب شمیم جے پوری، وسیم بریلوی اور اظہار عنایتی بھی شریک تھے۔

یہ ذکر فضول کہ مشاعرہ پھر بھی احمد فراز اور حمایت علی شاعر کے ہاتھ رہا۔ نظامت حسب معمول ملک زادہ صاحب نے بڑی خوبصورتی سے انجام دی۔

۴ جون کی شام کو احمد فراز ڈاکٹر رفیق جان کی دولت کدے پر مدعو تھے یہ ڈاکٹر بھی کوہاٹ کے رہنے والے ہیں اور احمد فراز کے ہمسایوں میں سے ہیں اس محفل میں سرحدیت سے زیادہ لکھنویت ٹپک رہی تھی کھانے کا انتظام بھی خوب تھا اور کھانا لذت کے اعتبار سے کسی لکھنو کے باورچی کے ہاتھ سے پکایا ہوا تھا۔

یہ ہر چیز سے نفاست اور شائستگی برس رہی تھی لذت کام و دہن کی تسکین کے بعد روحانی غذا کا انتظام ہوا اور شعر و سخن کا دور شروع ہوا جس میں وہاں سامعین نے شعراء کا کلام پورے ذوق وشوق

کے ساتھ سنا دوسرے دن فراز واشنگٹن چلے گئے اور میں سٹرابری کینیڈا واپس چلا آیا اور اس طرح اس امید پر کہ جلدی ہی فراز سے پھر ملاقات ہوگی حسین اور خوشگوار یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

احمد فراز اس دور کے صرف ایک اہم اور منفرد شاعر ہیں بلکہ نئی نظم وغزل کے ارتقاء اور اس کی تعمیر میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں انہوں نے چالیس سال تک آمریت جبریت اظہار رائے اور خیال پر پابندیوں کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ بڑی دلیری سے مقابلہ کیا ہے اس کا اندازہ ان کے ماسواء ان کے تمام رفیقوں اور ساتھیوں کو بھی ہے اردو ادب میں ان کا شمار جدید نظم کے معماروں میں بھی ہوگا اور ہماری شاعری کو جدید احساسات رجحانات اور تخلیقی اثرات پیدا کرنے والوں میں بھی۔ انہوں نے ہماری ادبی زندگی کو نئی معنویت عطا کی اعتبار دیا نئی تازگی بخشی انہوں نے ملک سے باہر رہنے والوں کو بھی ملک دوستی اور حب الوطنی کا سبق سکھلایا اور ملک میں کیونکر صحت مند فضا قائم کی جاسکتی ہے اس کا راستہ بھی دکایا۔ ہم کینیڈا والے بس یہی چاہتے ہیں کہ وہ رہیں کہیں بھی مگر یہاں پر برابر آتے رہیں کہ ان کی موجودگی میں ہم ان سے اسی بہت سی باتیں سیکھتے ہیں جو کہ دوسرے ذرائع سے ممکن نہیں۔

(یہ مضمون ''پذیرائی کتاب سے لیا گیا ہے ڈاکٹر محمد شفیق کا مشکور ہوں جو اس مضمون کے لئے تعاون فرمائے)

اشفاق حسین

کینیڈا

نقطہء نظر

(احمد فراز اپنے انٹرویو اور بیانات کی روشنی میں)

ایک زمانہ تھا کہ ہم کسی شاعر یا ادیب کے خایالات جاننے کے لیے اس کی شعری یا نثری تخلیقات کے علاوہ اس کے لکھے ہوئے خطوط یا اس کی سوانح یا اس کے بارے میں لکھے گئے مضامین ہی پر بھروسہ کرتے تھے مگر زمانے کے ساتھ ساتھ اس صورتِ حال میں بھی تبدیلی آئی۔ اب یہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کا دور ہے‘ ذرائع ابلاغ میں بے پناہ وسعت ہو چکی ہے۔ اس وسعت نے ہمارے لیے کئی آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور ان میں سے ایک بہت بڑی آسانی‘ تخلیق کار سے براہِ راست انٹرویو کا سلسلہ بھی ہے۔ انٹریو کے ذریعے کیے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات ریڈیو‘ ٹیلی ویژن‘ اخبارات اور رسالوں کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح ایک عام آدمی کو اپنی پسندیدہ یا ناپسندیدہ دونوں طرح کی شخصیتوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ انہیں معلومات کی بنیاد پر کسی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو کسی بھی لکھنے والے خیالات‘ اس کے نظریات اور اس کے بنیادی موضوعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا یہ ایک بہت گراں قدر وسیلہ ہے۔ اگر اس وسیلہء اظہار کی راہوں میں کردار کشی اور بد طینتی کے کانٹے نہ بچھے ہوں تو کوئی بھی انٹرویو اپنے اصل مفہوم کے قریب ہو سکتا ہے اور اس طرح کسی شخصیت کی تفہیم میں پیدا ہونے والے الجھاوے دور ہو سکتے ہیں۔

معلومات کے اس ذریعے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اپنے دور کے ایک نہایت مقبول اور

کسی حد تک متنازعہ شخصیت کے حامل احمد فراز کے خیالات اور نظریات کی چھان پھٹک کریں تو بہت ساری غلط فہمیوں کی خود بخود تردید ہو جائے گی اور بہت ساری چیزیں اپنے اصل سیاق وسباق میں روشن سے روشن تر ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر و بیشتر موقعوں پر ان کے نقطۂ نظر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے لیکن پھر بھی ان کے انٹرویؤان کے بیانات اور ان پر شائع ہونے والے بہت سے خصوصی نمبروں کے صفحات پر ان کے صحیح فکری خدوخال بہ آسانی ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ بہت سے موقع پر ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی قسم کے سوالات مختلف پیرایوں میں کئے گئے ہیں اور جوابات کی قوس وقزح کے رنگ بھی کہیں کہیں مختلف نظر آجاتے ہیں۔ مگر ایسا ہونا ایک فطری امر ہے اصل چیز جو ہمیں دیکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم ان جوابات میں پنہاں ان کے خیال کی روح یا مقصد کی تلاش کا عمل جاری رکھیں۔ اس طرح بظاہر نظر آنے والا تضاد ایک معنوی اکائی کی شکل اختیار کرلے گا۔ یہ فکری اکائی اگر کھل کر نہیں تو بین السطور میں ضرور بول اٹھے گی۔

اپنے بیانات‘ انٹرویو یا تخلیقات کے حوالے سے اکثر و بیشتر احمد فراز صاحب کی شخصیت متنازعہ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بولے گا اور کھل کر بولے گا تو اسی کے زبان وبیان اور موضوع کو ہی گرفت میں لایا جاسکے گا۔ سو احمد فراز صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ اس کے باوجود ان کے انٹرویو میں ان کی شخصیت کی نظریاتی اساس ایک روشن لکیر کی طرح نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ انٹرویو بے حد اہم ہیں۔

بیشتر انٹرویو میں کیے جانے والے سوالات چند موضوعات ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ وہی سوالات بار بار گھوم پھر کر کیے گئے ہیں کہ جن کے جوابات وہ پہلے ہی اپنے کسی نہ کسی انٹرویو میں دے چکے ہوتے ہیں۔ میری کوشش یہ ہے کہ وہ سوالات جو بار بار ان سے کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں فراز صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ان سوالوں کو پیش نظر رکھ کر یہ انتخاب ترتیب دیا گیا ہے۔

کیا احمد فراز کافر اور ملحد ہیں؟

احمد فراز سے کیے جانے والے مختلف انٹرویو میں یہ سوال یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور سوال کئی موقع پر کیا گیا ہے۔ اس سوال کا جواب انہوں نے نہایت وضاحت سے دیا ہے اور اس بات سے قطعی انکار کیا ہے کہ وہ مذہب کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ البتہ مذہب کے نام پر کسی بھی معاشرے میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ کے وہ پرزور مخالف رہے ہیں۔ اسلام کا جو ایک ترقی پسند پیغام عام انسانوں کے لیے ہے اسے انہوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں نعت وسلام کی شمولیت ہی اس بات کا ایک بین ثبوت ہے۔ رثائی ادب کے ان نمونوں میں یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ ان کے ممدوح حسین ہوں یا محمد وہ ایک انقلابی فکر اور برتر انسانیت کے نمونوں کے طور پر ابھرتے ہیں اور ان کرداروں کی عظمت کے آگے احمد فراز کا سرِ تسلیم خم نظر آتا ہے۔ اپنے اوپر لگنے والے ملحدانہ اور کافرانہ الزامات کے ضمن میں ایک انٹرویو میں اس سوال کا جاب احمد فراز یوں دیتے ہیں کہ ''مجھ پر بہت سے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی ہے کہ میں ملحد ہوں' بے دین ہوں' اسلام دشمن ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جہاں اور جگہوں پر اچھے لوگ موجود ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی صاحبان میں بھی ایسے کچھ اچھے لوگ ہیں اور اس کے برخلاف بھی ہیں۔ تو جو مولوی کے خیالات سے ذرہ برابر انکار کرے وہ دشمنِ دین اور ملعون ہو جاتا ہے جبکہ اسلام نے تو منافق کو بھی کافر نہ کہنے کو کہا ہے اور اسے چھوٹ دی ہے۔ یہاں ایک امام صاحب جو اپنا ایک اخبار بھی رکھتے ہیں انہیں کسی سبب مجھ سے عناد تھا۔ انہیں چونکہ اشتہارات لینے ہوتے تھے اس لیے انہوں نے کہا کہ فراز کے خلاف یہ کرو' ہو لکھو تا کہ اشتہارات آسانی سے ملنے لگیں۔ انہوں نے مجھ پر ایڈیٹوریل تک لکھے اور کہا کہ فتاویٰ جہانگیری کی رو سے میرا قتل بھی واجب ہے۔ پھر انہوں مسجدوں میں کچھ اماموں سے میرے خلاف خطبے بھی دلوائے۔ میں دوسرے اماموں سے کچھ نہیں کہتا وہ شاید معصوم تھے۔ کیونکہ اگر کسی بھی مسلمان سے کہا جائے کہ کوئی شخص اسلام کا تمسخر

اڑاتا ہے، واہی تباہی بکتا ہے اور دشمن دین ہے تو ظاہر ہے اس شخص کا پہلا تاثر تو غصّے اور نفرت ہی کا ہوگا۔ وہ اگر مجھ سے تصدیق کر لیتے تو اچھا ہوتا۔ ایک اور وزیر صاحب نے میری نعت پر فتویٰ لگا دیا کہ نعوذ باللہ میں اسلام اور رسول اللہ کے خلاف ہوں حالانکہ بعد میں میری اس نعت کو اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی بھیجا گیا اور وہاں سے بھی یہ جواب آ گیا کہ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے مگر میں معتوب ہی رہا۔ میرے حق میں اسلامی نظریاتی کونسل کے جواب کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا گیا پھر وہ نعت چٹان میں بھی چھپی اور انہوں نے یہ نوٹ لگایا کہ اس میں کوئی ایسی قابل اعتراض چیز نہیں ہے مگر میں پھر بھی معتوب ہی رہا'' اس جواب کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس نعت کو دوبارہ پڑھیں اور دیکھیں کہ اس میں خلافِ اسلام کیا بات کی گئی ہے؟

ظاہر ہے کہ ادب کی معمولی سی شد بد رکھنے والا بھی اس نعت کو کسی اعتبار سے توہینِ رسالت کے دائیرے میں نہیں داخل کرے گا۔ ہاں اس میں احتجاج کی ایک لے ہے، درد کی ایک کسک ہے آرزومندی کے بکھرے ہوئے خواب ہیں اور ان سب کے نتیجے میں جو ایک فضا بنتی ہے وہ سراسر منبی بر خلوص ہے۔ اس میں عقیدت کے جذبے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔ اسی طرح امام حسین کی بارگاہ میں سلام پیش کرتے ہوئے ان کی انقلابی طبیعت اور عقیدت کا دریا جوش میں آتا ہے۔

حسین تجھ پہ کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تو عظیم ہے بے ننگ و نام ہم جیسے
برنگِ ماہ ہے بالائے بام تجھ جیسا
تو فرشِ راہ کئی زیرِ بام ہم جیسے
وہ اپنی ذات کی پہچان کو ترستے ہیں
جو خاص تیری طرح ہیں نہ عام ہم جیسے
یہ بے کلیم جو ہر کربلا کی زینت ہیں

یہ سب ندیم یہ سب تشنہ کام ہم جیسے
بہت سے دوست سرِ دار تھے جو ہم پہنچے
سبھی رفیق نہ تھے سست گام ہم جیسے
خطیب شہر کا مذہب ہے بیعتِ سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے
تو سر بریدہ ہوا شہرِ نا سپاساں میں
زباں بریدہ ہوئے ہیں تمام ہم جیسے
پہن کے خرقہِ خوں بھی کشیدہ سر ہیں فراز
بغاوتوں کے علم تھے مدام ہم جیسے

احمد فراز صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں اسلام کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت ایک اور جگہ پر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے دین میں جو وسعت ہے وہ دنیا کے کسی دین میں نہیں ہے لیکن جس طرح ہندو معاشرے میں برہمن کو ہی یہ حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے بلکل اسی طرح ''ہمارے اندر بھی بہت سے لوگ برہمنوں کا روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ بہت سے جاہل لوگ بدعتیں اور خرافات پھیلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ انہوں نے اسلام کی آڑ میں کھانے کمانے کا سلسلہ چلا رکھا ہے۔ ایک بار ہم ایک گاؤں گئے وہاں ہم نے ایک بی بی سے پوچھا کہ آپ نے قراں پڑھا ہے تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا توبہ توبہ ہم کہاں قران پڑھ سکتے ہیں یہ تو ہمارے پیر بابا ہی پڑھ سکتے ہیں''

اس طرح کے واقعات جب ایک پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے شخص کے سامنے آتے ہیں تو وہ اس کا ردعمل بھی ظاہر کرتا ہے۔ احمد فراز بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ شاعر اور ادیب سے تو لوگوں کو یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ان مسائل میں ان کی رہبری کا بھی

فریضہ انجام دیں۔ اسی پس منظر میں تو اقبال نے دیدہ ء بینائے قوم، کی ترکیب استعمال کی تھی۔

کیا احمد فراز ایک محبّ وطن شاعر ہیں؟

احمد فراز کی حب الوطنی بھی اکثر و بیشتر SON OF THE SOIL ہونے کے باوجود مشکوک ہی رہی ہے۔ اس حوالے سے بھی ان سے کئی موقعوں پر سوالات کیے گئے ہیں اور ان کے جوابات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وطن دوستی اور وطن پرستی کا ان کا اپنا ایک خاص نقطہ ء نظر ہے جو بہت سے لوگوں کو ناپسند ہے۔ بہت سوں کے لیے یہ وطن دشمنی کے مترادف ہے، مگر بقول فیض

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

احمد فراز اس سوال کے جواب میں زیادہ تر جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے جوابات میں بھی ایک خاص قسم کی شدت اور درد و کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''مجھے کسی سے اپنی حب الوطنی اور اسلام کا سرٹیفکٹ نہیں لینا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد اسی زمین میں دفن ہیں اور میں نے اپنے قلم سے عہد کر رکھا ہے کہ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں میں ہمیشہ سچ کہوں گا۔ میں چونکہ چھوٹا آدمی ہوں لہٰذا معتوب ہوں ورنہ اقبال اور فیض نے بھی ہر دور میں صاف صاف کہا ہے مگر وہ اس لیے بچ گئے کہ وہ عالمی پیمانے پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میں جس بات پر معتوب ہوں وہی بات وہ کہیں تو ان کی عزت ہے انہیں بلاک عہدے پیش کیے جاتے ہیں اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ میں کبھی گلٹی نہیں ہوا، کبھی ضمیر کے سامنے نادم نہیں ہوا۔ میں نے ہر قسم کے حالات سے گزرنے کے باوجود شکایت نہیں کی اور یا تب کہتا ہوں جب لوگ مجھے کہتے ہیں کہ اب بات حد سے گزر چکی ہے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے خلاف تو ہر قسم

کی باتیں چھپ جاتی ہیں اور بعض کے اپنے اخبار بھی ہیں وہ جو چاہیں چھاپ سکتے ہیں مثلاً وہ اخبار جس کی جنگ سے چل رہی ہے اور جس نے میرے خیال میں اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے میرے خلاف بہت غلط خبر چھاپی ہے مگر اصل بات کوئی نہیں چھاپتا" حب الوطنی کے حوالے سے جب ایک باران سے کسی نے سوال کیا تو اس کے جواب میں احمد فراز نے خود ایک سوال قائم کیا اور کہا کہ "میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ جب کسی کو ملک دشمن کہا جاتا ہے تو کن محرکات کے سبب کہا جاتا ہے۔ میں جمہوریت کی، سچائی کی اور علم کی بات کرتا ہوں، مفلسی و غربت دور کرنے کی بات کرتا ہوں اور سرمایہ دار کے خلاف کچھ کہتا ہوں تو کیا یہ غیر محبِّ وطن ہونے کی نشانی ہے؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب سیدھے سادھے لفظوں میں تو دیا نہیں جا سکتا کیوں کہ حُب وطن کا معیار کو متعین کر سکتا ہے۔ کسی ملک کے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی آزادیٔ اظہار کا حق استعمال کرتا ہے تو اسے کسی بھی طرح غیر محبِّ وطن نہیں کہا جا سکتا۔ بد قسمتی سے پاکستان میں کمزور سیاسی نظام کی وجہ سے اکثر و بیشتر اہلِ قلم کو اس تکلیف دہ صورتِ حال سے گزرنا پڑا ہے۔ فیض نے اسی پس منظر ہی میں تو کہا تھا۔ نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں۔ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ جلا وطنی کے دنوں میں احمد فراز بھی اسی تکلیف دہ صورتِ حال سے گزرے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ "میرا بھی اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے لوگوں کا ہے۔ تو جس بات کے لیے میں کوالیفائی کرتا ہوں تو میرا حق بنتا ہے کہ میں اس پر رہوں۔ ظاہر ہے مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے کچھ کرنا ہے تو جو کام میں جانتا ہوں میں وہی کرنا چاہوں گا" چنانچہ احمد فراز نے قلم ہاتھوں میں لیا اور اسے ایک امانت کے طور پر استعمال کیا۔ جب ہی تو محاصرہ والی نظم میں کہا تھا کہ مرا قلم مری سب سے بڑی عدالت ہے۔

احمد فراز کی وہ شاعری جو سیاسی شاعری کے دائرے میں آتی ہے اس کا لہجہ احتجاجی ہے اور جب اس احتجانی لہجے میں اشعار کہے گئے تو حکومتِ وقت کے حامی صحافیوں' کالم نگاروں اوور میڈیا سے تعلق رکھنے والوں نے اس صدائے احتجاج کی پرزور مخالفت کی۔ جلاوطنی کے دوران جب وہ ایک بار ہندوستان گئے تو ان دنوں دہلی کے پاکستانی سفارت خانے میں ڈاکٹر حسن رضوی نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال پوچھا کہ کیا آپ پاکستانی اخباروں میں اپنے بارے میں چھپنے والی خبروں سے آگہ ہیں تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''صرف چند خبروں ہی سے نہیں چند کالموں سے بھی آگہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ پر ملک دشمنی اور غیر محبّ وطن ہونے کے الزام لگائے گئے ہیں۔ اگر میں غیر محبّ وطن ہوتا تو یوم پاکستان کی اس تقریب میں نظر نہ آتا۔ پاکستان ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ ہم اس سے علاحدہ ہو کر کہیں بھی سکون نہیں پا سکتے۔ میں ان لوگوں کے پاسپورٹ دیکھ کر خوف سے کانپ جاتا ہوں جنہون نے غیر ملکوں میں سیاسی پناہ لے رکھی ہے۔ ان پاسپورٹوں پر لکھا ہوتا ہے۔ تمام ملک سوائے پاکستان۔ میں اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پاکستان میرا وطن ہے اور میں دنیا میں اسی کے پاسپورٹ پر سفر کرتا ہوں۔ ایک اور سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''ایک کالم نویس نے میری پرانی نظم ''اے بھوکی مخلوق'' کو بنیاد بنا کر یہ لکھا کہ یہ میری تازہ نظم ہے اور میں نے اس میں پاکستان کے خلاف باتیں لکھی ہیں۔ حالانکہ یہ نظم میرے مجموعے ''تنہا تنہا'' میں چھپ چکی ہے اور اتفاق سے اس کے اختتام پر ۱۴ اگست ۱۹۵۴ کی تاریخ بھی شائع ہوئی ہے۔ ایک کالم نویس نے اس کی تاریخ کو نظر انداز کر کے اسے میری تازہ نظم قرار دیا۔ جہاں تک پاکستان کے خلاف ہونے کی بات ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں میں لکھے گئے میرے قومی نغمے اور ترانے ''شب خون'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں''

اپنی حب الوطنی کے حوالے سے احمد فراز نے ایک جگہ بہت ذاتی نوعیت کا ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے لیکن اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وطن اور وطن سے محبت کے معیارات ان

کی نظر میں کیا ہیں۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ایک تقریب میں ایک خاتون انہیں پان کھلانے پر بہت بضد تھیں تو میں نے انہیں بتایا کہ میں پان نہیں کھایا کرتا۔ انہوں نے کہا کہ تم تو پان کھایا کرتے تھے۔ میں نے کہا ہاں کھایا تو کرتا تھا مگر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء جب سے ڈھاکہ فال ہوا ہے اس دن سے میں نے پان نہیں کھایا کیونکہ پان سے میری ایسوسی ایشن مشرقی پاکستان سے تھی۔ یہ سن کر وہ خاتون دم بخود رہ گئیں اور پھر کہنے لگیں کہ جس دن وہ مجھے پان کھاتے ہوئے دیکھ لیں گی تو وہ سمجھیں گی کہ اب مجھے ملک سے دلچسپی نہیں رہی۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جسے انہوں نے یوں ہی رواروی میں انٹرویو دیتے ہوئے بیان کر دیا لیکن اس واقعے سے وطن کے بارے میں احمد فراز کے جذبات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایک موضوع پر اس قدر جذباتی ہوگا تو اس کی جھلک بھی اس کی شاعری میں نظر آئے گی۔ چنانچہ جب وہ اپنے اس وطن کو اپنی آنکھوں میں سجے ہوئے خوابوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اس میں انہیں کچھ خامیاں نظر آتی ہیں تو وہ اس پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جب اس صدائے احتجاج کی لے ذرا تیز ہو جاتی ہے اور ایوانِ اقتدار میں اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے تو اس وابستہ لوگ اپنے رزق کی مصلحت کا شکار ہو کر جواباً انہیں وطن دشمن اور غیر محبِّ وطن کہتے ہیں۔

احمد فراز کی ترقی پسندی اور اس کے معیار

احمد فراز ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں چنانچہ ان سے اس موضوع پر کوئی سوال پوچھے بنا کوئی انٹرویو کیسے مکمل ہوسکتا ہے؟ بہت سے انٹرویو کرنے والوں نے ان سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور ان کا جواب نہایت صاف اور دوٹوک رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ترقی پسندی سے متعلق کئے جانے والے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ”ترقی پسندی کے میں جو معنی لیتا ہوں وہ ترقی پسندی ہی ہے۔ آپ تاریخ کے کیلینڈر کو پیچھے تو نہیں لے

جا سکتے۔ ہر شخص اپنے افکار میں اپنے فن میں اور دنیا میں آگے ہی بڑھنا پسند کرتا ہے۔ ترقی ہی کرنا پسند کرتا ہے۔ پرانے زمانے کی جو جہالت سرمایہ داری اور جاگیرداری ہے ان کے خلاف جدو جہد کرنا، مخلوقِ خدا کو ان کے چنگل سے نکالنا، اس کی سوچ کو آگے بڑھانا میرے نزدیک ترقی پسندی ہے" ایک اور جگہ انہوں نے اپنے ترقی پسند نظریات وخیالات کا اظہار زیادہ واضح لفظوں میں یوں کیا "وہ لوگ جن کا شاعری میں کوئی نصب العین نہیں ہے اور شاعری کو صرف تفریح کی حیثیت سے لیتے ہیں کہ بس واہ واہ ہو جائے تو میں انہیں برا نہیں کہتا مگر میں ان کی قدر کرتا ہوں جو کسی سوشل یا پولیٹکل پروگرام پر چلنے اور لوگوں کے اصل مسائل کو ڈسکس کرتے ہیں مثال کے طور پر اقبال کو لیں۔ کیا انہوں نے شاعری کے ذریعے ایک پیغام لوگوں تک نہیں پہنچایا؟ انہوں نے تو اپنا سارا میسج شاعری ہی کے ذریعے دیا تھا۔ تو آج کے مسائل جو کہ ہم زیادہ واضح طور پر دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ شاعر کسی خاص اور مثبت نظریے پر کام کرے۔ میں پھولوں، پہاڑوں اور دریاؤں وغیرہ پر شاعری کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ چیزیں مجھے بھی عزیز ہیں مگر میں زیادہ تر انسانیت پر سوچتا ہوں۔ آج کل مسائل اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک شاعر چاہے بھی تو ان سے خود کو نہیں ہٹا سکتا۔ مسائل ہر دور میں ہوتے ہیں غالب کے عہد میں بھی تھے مگر پھر بھی اس دور میں اس قدر نہیں تھے اور نا ہی دنیا کے دوسرے مسائل سے لوگ آج کی طرح بہرہ ور ہو سکتے تھے آج کے عہد میں تو فاک لینڈ اور فلسطین کی خبریں بھی چند لمحے میں پہنچ جاتی ہیں۔ میں کمٹ منٹ کا شاعر ہوں۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں تاہم جو بھی شخص جو بھی نظریہ میرے خیالات کو آگے پڑھانے میں اور لائن آف ایکشن دینے میں مدد کرے تو اس سے کچھ وابستگی تو ہو جاتی ہے"

احمد فراز ادب کے ترقی پسند نظریے کو کسی تحریک سے بھی آگے کی چیز سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاتمی کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے لندن میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "جس طرح قانون کی کتاب سے کہیں آگے جا کے انصاف ہوتا ہے اسی طرح کسی تحریک کے منشور سے کہیں آگے

جا کے ادب ہوتا ہے۔ حضرت علی سے کسی نے پوچھا کہ ظلم کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ کسی چیز کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا کر غلط جگہ پر رکھ دینا پھر پوچھا گیا کہ انصاف کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ جو چیز غلط جگہ پر رکھ دی گئی ہو اسے اس کی اصلی جگہ پر رکھ دینا۔ تو بات یہ ہے کہ جہاں آپ دیکھیں کہ ظلم ہو رہا ہے یا سماجی ناہمواری اتنی بڑھ گئی ہے کہ انسان ذلت کی حدوں کو چھو رہا ہے تو اس کے خلاف لکھیں''

حقیقت یہ ہے کہ ظلم یا استحصال تو ایک اضافی قدر ہے ہر شخص کے دیکھنے کا انداز جدا جدا ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں احتجاج کی راہیں بھی جدا جدا ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے کچھ لوگ مل کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم بناتے ہیں، مشترکہ لائحہ عمل بناتے ہیں تاکہ ان کے طے شدہ مقاصد کی تکمیل آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ اسی ضرورت کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اب اگر آج کے بدلے ہوئے حالات میں تنظیم نہیں ہے یا زیادہ فعال نہیں ہے تو اسے موجودہ حالات ہی کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ ویسے جہاں تک احمد فراز صاحب کا تعلق ہے تو وہ ابتدا ہی سے نہ صرف یہ کہ ترقی پسند خیالات کے حامی رہے ہیں بلکہ وہ تنظیمی سطح پر بھی اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کا قیام عمل میں آیا تو وہ پشاور کی ذیلی شاخ کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی کوشش کے اس پس منظر میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے سوال کو ذرا اور وسعت دیتے ہوئے احمد فراز نے کہا کہ ''اگر تحریک کی صورت میں اجتماعی طور پر ایک قافلے کی شکل میں آگے بڑھا جا سکتا ہو تو اس سے اچھی تو بات ہی کوئی نہیں۔ اس سے طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ صورت تو ایک طرح سے موجود بھی ہے گو بظاہر اس کا ڈھانچہ نظر نہیں آتا لیکن اگر غور کریں تو ہماری رفاقتیں جو غیر مرئی رشتوں میں پروئی ہوئی ہیں وہ ایک طاقت کی صورت میں موجود ہیں لیکن جہاں یہ محسوس کیا جائے کہ اجتماعی جدوجہد ممکن نہیں جیسا کہ پاکستان میں ترقی پسند تحریک پر پابندی ہے تو وہاں انفرادی طور پر جو آپ کر سکتے ہیں کریں مثلاً اگر ہم چار پانچ مل کر سچ نہیں بول سکتے تو ایک تو اپنے طور پر بول سکتا ہے۔ ویسے بھی کسی میں حوصلہ کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ' کیونکہ طاقت' حوصلہ اور علم

میں انسان ایک دوسرے سے کمتر یا برتر ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بارے میں ڈاکٹر حسن رضوی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اس تحریک کو بڑے شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ترقی پسند ادب کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کوئی ایسا ادب تو نہیں جسے خاص عرصے کے بعد مر جانا ہے۔ اس کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ زندگی کے نئے تقاضوں کو اپنایا جائے۔ یہی سبب ہے کہ یہ تحریک باوجود اتنی دشواریوں رکاوٹوں اور پابندیوں کے آگے بڑھتی رہی اردو ادب کی کسی اور تحریک نے اتنے زندہ لکھنے والے پیدا نہیں کیئے جتنے اس تحریک نے پیدا کیئے۔ حالی اور آزاد نیچر سے آگے نہیں بڑھ سکے یا پھر کچھ امید اور خوشی کی باتیں انہوں نے کیں لیکن ہمارے عہد کے لکھنے والوں نے اس سے بہت آگے بات بڑھائی ہے۔ اور اپنے وطن یا دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کوئی زیادتی بے انصافی یا استحصال ہوا ہے تو اس کے خلاف لکھا ہے اور بھر پور لکھا ہے"

احمد فراز کی جلاوطنی

پاکستان میں جب ضیا الحق کا مارشل لا آیا تو وہ پہلے مارشل لا سے بلکل مختلف تھا۔ یہ صرف اقتدار پر قبضے کا قصہ نہیں تھا بلکہ پورے معاشرے کو ایک خاص انداز سے دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کا منصوبہ تھا۔ چنانچہ پاکستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ وہی دور تھا جب فیض نے کہا تھا کہ مرے دل مرے مسافر۔ ہوا پھر سے حکم صادر۔ کہ وطن بدر ہوں ہم تم......

فیض نے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جلاوطنی کی جو راہ اختیار کی تھی اسی راستے پر احمد فراز نے بھی قدم رکھا۔ اپنی جلاوطنی کے اس دور کے بارے میں انہوں نے اس زمانے میں جب بھی اظہار خیال کیا اس میں اپنے دل کی کیفیت کے ساتھ ساتھ اس دور میں ہونے والے ظلم اور زیادتی کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انہیں زبردستی جلاوطنی کا راستہ اختیار کرنا پڑا بلکہ ہمیشہ بڑے دکھ کے ساتھ اس دور کے گھٹن آمیز ماحول کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک

انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ”میں ملک میں رہا مصائب جھیلے پھر بھی میں ملک نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن ۱۹۸۲ء میں کراچی پریس کلب کے مشاعرے کے بعد جب مجھے سندھ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری نقل و حرکت پر بھی پابندی لگائی جارہی ہے اور میرے ملک کے بعض حصے بھی مجھ پر بند کیے جارہے ہیں۔ میری شاعری کرنے‘ پڑھنے اور شائع کرنے کے حق پر پہلے ہی پابندیاں تھیں اور یہ سندھ بدر کرنا اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئی اور میں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ آزادی سے لکھ سکوں اور اظہار کرسکوں“

جلاوطنی کے ان دنوں کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ ”میں نے اس عرصے میں عمر کے لحاظ سے اور اس معنی میں کہ میں اپنے پیاروں سے دور رہا‘ یہ برس گنوائے ہیں لیکن میں نے اپنے تجربے اور علم میں اضافہ کرلیا ہے۔ میں نے ان برسوں میں ساٹھ کے قریب نظمیں لکھی ہیں۔ میری نوٹ بک بھری پڑی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایک جلاوطن کے طور پر وطن سے میری دوری اور غم و غصے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جاری جدوجہد کے شعور اور ان کے ساتھ وابستگی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ سب سے قیمتی سرمایہ وہ محبت ہے اور وہ پیار ہے جو مجھے ملک سے باہر اپنے ہم وطنوں سے ملا ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان سے اتنی دور رہنے والے ہم وطن میری شاعری سے اتنے مانوس ہوں گے اور وطن سے اتنی جذباتی وابستگی رکھتے ہوں گے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شاعری اتنی طاقتور ہوسکتی ہے۔ برطانیہ‘ ناروے‘ سوئڈن‘ کینیڈا اور امریکہ میں مجھے بار بار مدعو کیا گیا اور محبت اور تعریفوں کے پھول برسائے گئے۔ بھارت میں بھی ایسا ہی زبردست ردعمل تھا۔ .... میرے لیے یہاں زندگی زیادہ مشکل ہے اور پاکستان میں حکام میرے خاندان پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ مجھے منہ بند رکھنے پر آمادہ کریں۔ ایک مرحلے پر جب میں نے کینیڈا ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیا تو انہوں نے میری بیوی کو بلایا اور خطرناک نتائج کی دھمکی دی لیکن میں نے اپنا منہ بند نہیں رکھا اور نا ہی اپنا قلم توڑا“

احمد فراز اور ان کی حسن و عشق کی دنیا

احمد فراز کی شخصیت کے گرد ہمیشہ ایک رومانوی ہالہ رہا ہے۔ کچھ ان کی شاعری، کچھ ان کی جاذب نظر شخصیت اور کچھ ان کے عشق کے افسانے یا حقیقتیں۔ تو ان سب کے بارے میں جاننے کی کچھ نہ کچھ خواہش ہر انٹرویو لینے والے میں رہی ہے۔ شراب و شباب کے بارے میں ان سے بہت سے سوالات کیے گئے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اچھے موڈ میں ان سوالوں کے جوابات دیے ہیں۔ اس موڈ کو اور اس کیفیت کو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب وطن اور مذہب کے حوالے سے کیے جانے والے سوالوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔ ان سوالوں کے جوابات اور عشق و محبت کے حوالوں سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے لہجے کی مٹھاس اور تلخی دونوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حسن و عشق اور شراب و شباب کی باتیں کرتے ہوئے ان کے لہجے میں بلا کی شوخی اور تازگی آ جاتی ہے۔ اور خاص بات یہ بھی ہے کہ کہیں کوئی معذرت خواہانہ لہجہ بھی نہیں ملتا۔

علامہ اقبال نے ہند کے شاعر و افسانہ نویس کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر سے کہا تھا کہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ احمد فراز نے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ "بلاشبہ ایک عمر تک ذہن پر عورت سوار رہتی ہے مگر پھر رفتہ رفتہ احساس ہونے لگتا ہے کہ عیاشی اور تعیش یا عشق و محبت اور چیزیں ہیں اور شاعری اور چیز ہے۔ اسی طرح شاعری کا شراب سے بھی کچھ تعلق نہیں ہے۔ اب یوں تو لوگوں نے شاعروں کو بلاوجہ بدنام کیا ہوا ہے۔ جس زمانے میں شراب کھلے عام ملا کرتی تھی یا ان کے کلب بنے ہوئے تھے تو وہاں ڈاکٹر، وکلا، تاجر اور دوسرے لوگ ہوا کرتے تھے اور ایک آدھ شاعر بھی نظر آ جاتا تھا۔ در حقیقت شاعری بڑی سنجیدہ چیز ہے۔ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ آدمی اپنے پورے ہوش و حواس میں ہو اور اس کا شعور پوری طرح بیدار ہو۔ جوش کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے کبھی شراب پی کر شاعری نہیں کی۔ اسی طرح ریاض خیر آبادی نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا جبکہ ان کی پوری شاعری میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں شراب کا ذکر نہ ہو"

شاعروں پر عشق کی تہمت کا جواب دیتے ہوئے اپنے تصور عشق کی وضاحت کچھ اس طرح سے کی ہے کہ "عام طور پر عشق کا الزام ہم شاعروں پر ہی عائد کیا جاتا ہے مگر صرف شاعروں کی بات نہیں

میرا خیال ہے ہر انسان بلاتخصیص اس میں شامل ہے۔ انسان تو پیدائشی عاشق ہے۔ سب سے پہلے بابا آدم نے عشق کیا اور تب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ قیس کو دیکھیں گو وہ تو انجینئر تھا' پہاڑ توڑنے والا ایک مزدور مگر اسے لیلیٰ سے عشق نے کیا بنا دیا۔ تو کیا شاعر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محبت کرے، عشق کرے''

یہ جو ایک کہاوت ہے کہ OFFENCE IS THE BEST DEFENCE تو یہاں پر بھی فراز صاحب نے یہی حربہ استعمال کیا ہے بلکہ اگر ان کے انٹرویو کو غور سے پڑھیں تو واضح طور پر یہ نظر آئیگا کہ وہ اکثر و بیشتر سوال پوچھنے والے سے ہی الٹا سوال کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی بات زیادہ وضاحت سے کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اب مندرجہ بالا انٹرویو ہی میں دیکھیے کہ کس خوبصورتی سے اپنے عشق کا جواز دیا ہے۔ ایک اور انٹرویو میں کہتے ہیں کہ ''میں کوئی یوسف ثانی تو ہوں نہیں کہ میرے ظاہری حسن کو دیکھ کر خواتین مرعوب ہوں اور مجھ پر فریفتہ ہو جائیں' شاعری ہی اس کی وجہ ہو تو ہو'' یعنی ایک طرح سے احمد فراز نے اپنی رومانوی شاعری کے ایک خاص دائرہ اثر کا بیان کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری بالخصوص غزل کی شاعری خواتین میں بے حد مقبول ہے اور احمد فراز کو خود بھی اس کا احساس ہے۔ انہوں نے اپنے انٹرویو یا بیانات میں کبھی اس کو چھپایا بھی نہیں ہے اور شاید اسی وجہ سے ان کی شخصیت خاصی متنازعہ بھی رہی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے جو چیز جس طرح ہے اس کو اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ باقی باتیں اپنے پڑھنے والے پر چھوڑ دی ہیں۔

آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کی شخصیت اور ان کے نظریہء فن کو سمجھنے کے لیے ان کے انٹرویو اور ان کے بیانات کو غور سے پڑھنا بے حد ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کی شاعری سے تو لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے کہ وہ شراب تو اپنے اندر ایک نشہ رکھتی ہی ہے مگر ان کے خیالات کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو پھر بقول ان کے ع: نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

(یہ مضمون ''پزیرائی کتاب سے لیا گیا۔ ڈاکٹر محمد شفیق کا مشکور ہوں جو اس مضمون کے لئے تعاون فرائے)

ہے سرفراز آج بھی پرچم فرازؔ کا

دنیائے اردو کے معروف شاعر احمد فرازؔ کی نیویارک آمد کے موقع ڈاکٹر صبیحہ صباؔ کا خراجِ تحسین

اترا ہوا ہے دشت میں موسم فرازؔ کا
ناداں غزال! سیکھ لے تو رَم فرازؔ کا

کیا کیا نہ نرگسوں میں رہی آبیدگی
دیکھا کبھی جو دیدۂ پرنم فراز کا
لالوں نے آپ اپنے جگر چاک کر لئے
تاجا کے لاسکے کوئی مرہم فرازؔ کا
وابستگانِ دل نے جو گھیرا فرازؔ کا
رستہ ہی دیکھتے ہیں ابھی ہم فرازؔ کو
سب اس کو چاہتے ہیں نئی نسبتوں کے ساتھ
ہر جائے نام ہے تو مکرّم فرازؔ کا
ان کا تو مصحفیؔ کی طرف ذوقؔ کی طرف
جانا کبھی ہوا بھی تو کم کم فرازؔ کا
سوداؔ و میرؔ و غالبؔ و بیدلؔ کی فکر سے
رشتہ ہے ایک عمر سے محکم فرازؔ کا
اقبالؔ کا اسیر ہے غالبؔ کا معتقد
اور مصحفیؔ سے ربط ہے پیہم فرازؔ کا

آلام جاں و فراقت جاناں کے بین بین
بربادیٔ چمن بھی ہے اک غم فرازؔ کا
نازک مزاج ہے کوئی شاعر برا نہیں
رکھئے خیال صاحب عالم فرازؔ کا
روشن اسی کے شعر سے ہے دل کی انجمن
کوئی چراغ بھی نہیں مدّھم فرازؔ کا
کیا منزلت نشاں تھے کہ اب سرنگوں ہوئے
ہے سرفراز آج بھی پرچم فرازؔ کا
☆حیدر بیؔ ہیں، انیسؔ و شفیقؔ و جمالؔ بھی
دیکھیں جسے بھرے ہے وہی دم فرازؔ کا
ہرنؔ سیکھتے ہیں تکلّم کے پیچ و خم
زخمِ ہنر پہ رکھتے ہیں مرہم فرازؔ کا
جس میں کلیدِ میکدہ گم ہوکے رہ گئی
ہے ماہِ صوم، ماہِ محرم فرازؔ کا

گو اور مجلسوں میں بھی اس کا گزر ہوا
ہاں گاؤں گاؤں شعر کے میلے لگے رہیں

غالبؔ ہی پیشوا رہا تاہم فرازؔ کا
آنا لگا رہے ہیں یوں ہی جم جم فرازؔ کا

ہر چند اس کی نظم رہی شعلہ پیرہن
ہر خوش نوا کا نام اسی کے سخن سے ہے

لہجہ مگر غزل میں ہے شبنم فرازؔ کا
چھیڑا ہے مطربوں نے تو سرگم فرازؔ کا

اس نے تو سارے زخم سرِ بزم رکھ دیئے
تصویر ابھی ادھوری ہے احمد فرازؔ کا

دیکھو جسے ہوا ہے وہ محرم فرازؔ کا
جب تک نہ ہو شفیقؔ سا ہمدم فرازؔ کا

آؤ صبا! ذرا کی ذرا چل کے دیکھ آئیں
آخر ہے کیوں دیوانہ اک عالم فرازؔ کا

☆ حیدر خواجہ محمد انیس، ڈاکٹر شفیق اور ڈاکٹر جمال قادری۔ احمد فرازؔ کے میزبان اور احباب

نیو یارک میں
احمد فرازؔ
تصویروں کی زبانی

احمد فراز ۔ ڈاکٹر محمد شفیق

جوہر میر، احمد فراز، مقبول

احمد فراز، سردار سوز، یٰسین مراد آبادی

ڈاکٹر جمال قادری، احمد فراز

احمد فراز، امریکن ادیبوں کے ساتھ

زرین یٰسین، فرزانہ نکہت شفیق، احمد فراز، ڈاکٹر محمد شفیق، محمد یٰسین

احمد فرازؔ، زرین یٰسین

ریحان شفیق، فرزانہ نکہت شفیقؔ، ڈاکٹر محمد شفیقؔ، سردار سوزؔ، احمد فرازؔ، محمد یٰسین

جوہر میر، احمد فراز، خلیق ابراہیم، مطلوب حسین

ڈاکٹر محمد شفیق، ڈاکٹر صبیحہ صبا، احمد فراز

محمد یٰسین، ڈاکٹر محمد شفیق، احمد فراز

زرین یٰسین، احمد فراز، محمد یٰسین

محمد انیس، ڈاکٹر سلمان، احمد فرآز، ڈاکٹر شمیم، فرزانہ نکہت شفیق
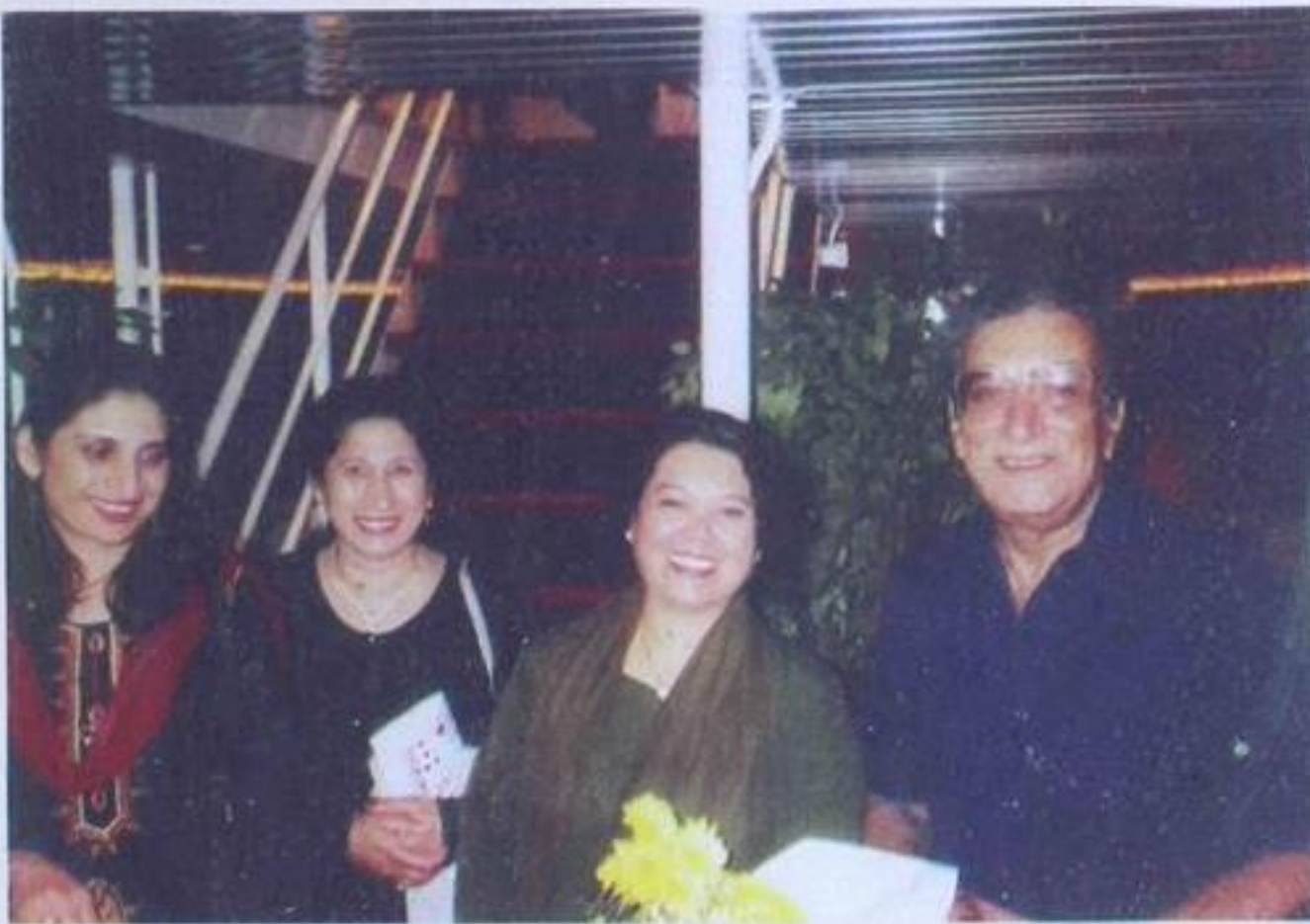
احمد فرآز، زرین لیسین، رفعت خان، فرزانہ نکہت شفیق

ہادیہ شفیق، احمد فراز، ریحان شفیق

ڈاکٹر محمد شفیق، احمد فراز

زرین یٰسین، احمد فراز
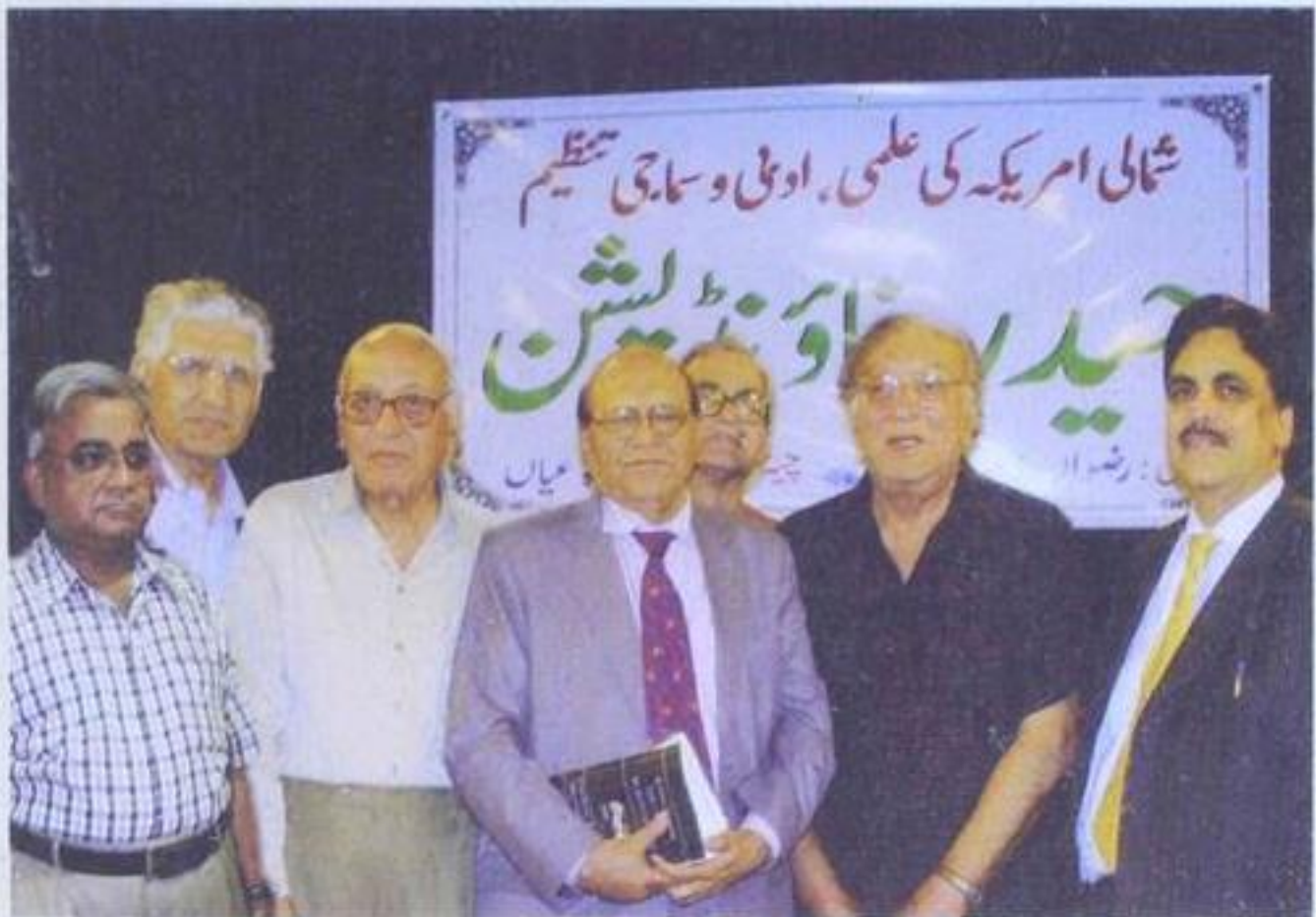
گروپ فوٹو
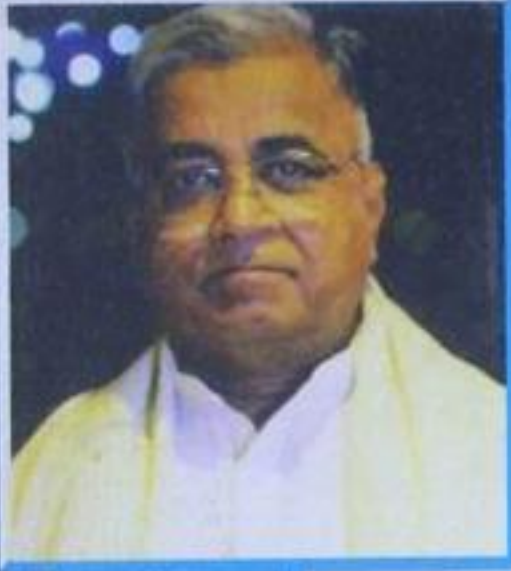
پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی بیجاپور دکن

کرناٹک اسٹیٹ ہندوستان میں ایک تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ خاندان میں جنم لیا۔ B.A, B.Com, M.A, Ph.D (Urdu) میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیجاپور دکن میں انجمن آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج میں صدر شعبۂ اردو، فارسی کے علاوہ کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں بطور Ph.D Guide خدمات انجام دیئے۔ ۱۹۹۲ء میں امریکہ نیویارک میں قدم رکھا اور نیویارک حکومت کے فلاح و بہبود محکمہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک اردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے درج ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

تصانیف

۱) اعجاز — مذہبی مضامین
۲) مضامین فاروقی — مختلف مضامین
۳) اور خون جلتا رہا — افسانے
۴) امریکہ میں انوار اردو ادب — امریکہ میں موجودہ شاعروں اور ادیبوں پر مقالات
۵) امریکہ میں گلزار اردو ادب
۶) گوہر ادب — کلاسیکل شاعروں اور ادیبوں پر مقالات
۷) مینار ادب — مقالات
۸) اردو شاعر اور تصوف مقابلہ برائے Ph.D تحقیقی وتنقیدی جائزہ
۹) کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ — خواتین کی ادبی خدمات پر گفتگو امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات
۱۰) عالمی اردو ادب میں رشیدہ عیاں کی شاعرانہ عظمت

ایوارڈز

۱) لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ اردو ۲۰۱۱ء، پونہ، ہندوستان
۲) حکومت کرناٹک۔ کرناٹک اردو اکیڈیمی ایوارڈ (''کینیڈا اور متحدہ ہائے ریاست امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات'' تصنیف پر)